بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

معاشرے کی اصلاح کے لیے ہر سنجیدہ مسلمان فکر مند ہے، جس مسلمان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ اور ہوش مندی کے آثار نظر آئیں گے، اس کی باتوں سے معاشرے کی روز افزوں برائیوں پر فکر وتشویش بھی جھلکتی ہوئی نظر آئے گی، لیکن خرابیاں ہیں کہ سیلاب کی طرح اُمڈتی چلی آرہی ہیں اور وہ کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی ہیں، اور اگر حقیقت سے چشم پوشی نہ کی جائے اور ظاہری احوال پر نگاہ ڈالی جائے تو ان کو بڑھنے سے روکنا ممکن بھی نہیں ہے، کیونکہ ان کو برا سمجھنے والے اور ان کی طرف سے تشویش میں مبتلا رہنے والے تو بہت تھوڑے سے لوگ ہیں، اور ان کو جنم اور فروغ دینے میں دنیا کی بہت ساری طاقتیں، بڑی بڑی کمپنیاں اور بے شمار دماغ لگے ہوئے ہیں، اور اس کے لیے بے پناہ سرمایہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شر وفساد کے جراثیم ہماری سوسائٹی کے جسم میں ہڈیوں تک سرایت کر رہے ہیں، جو اس کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹتے چلے جا رہے ہیں۔

ان حالات کی وجہ سے ہر شخص پریشان ہے، اور پریشان ہونا فطری اور طبعی ہے، اس لیے کہ کسی کو اپنا ماحول اور گرد وپیش محفوظ نظر نہیں آرہا ہے، اگر کوئی گھر یا جگہ محفوظ ہے تو کب تک بچا رہے گا، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

برائی اور ضلالت وگمراہی تو روئے زمین پر ہمیشہ رہی ہے، اور جیسے جیسے دنیا خاتمہ کے قریب ہوتی جائے گی، ان کی افزائش اور اس کے سرچشمے بڑھتے ہی جائیں گے، ان کے گھٹنے اور کم ہونے کا تو کوئی امکان نہیں ہے، البتہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ ان سے بچنے اور اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو بچانے کی حتی المقدور کوشش کرے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر (اچھی بات کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا) اسلام کا ایک

مستقل فریضہ اور اس کی نہایت اہم تعلیم ہے، قرآن کریم کے اندر نہایت اہمیت کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اور اس کی اہلیت وصلاحیت رکھنے والے مسلمانوں کو کم از کم اپنے دائرۂ اثر تک اس کام کو انجام دینے کی سخت تاکید کی گئی ہے، آنحضور سرور عالم ﷺ نے بھی اس کی سخت تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ رَأى مِنْكُمْ مُنْكراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَدْنىٰ الإِيْمَانِ ، یعنی تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکتا ہو، تو دل سے برا سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کمتر درجہ ہے۔ اس ارشاد نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ برائی کو اپنے دل سے برا سمجھے، اگر دل سے بھی برا نہ سمجھا جائے تو گویا کمزور درجے کا ایمان بھی نہیں ہے۔

اس حدیث میں نہایت اہمیت اور تاکید کے ساتھ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر مسلمان کو برائی کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے ، البتہ ہر شخص کا ایک دائرۂ اثر اور ایک اہلیت ہوتی ہے، اور اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی فکر کرنی چاہئے ۔ زیادہ نہیں ۲۰-۳۰ سال پہلے یہ ماحول تھا کہ گاؤں محلے کا کوئی بھی بڑا آدمی کسی لڑکے یا چھوٹے کو غلط کام کرتے ہوئے دیکھ کر روک ٹوک کر دیا کرتا تھا، لیکن آج وہ ماحول نہیں ہے، آج کوئی آدمی کسی دوسرے کے لڑکے کو اس کی غلطی پر ٹوک دے تو لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔

روز افزوں اور دن بدن بڑھتی ہوئی برائی سے اپنے آپ اور گھر بار کو بچانے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہر شخص کم از کم اپنے گھر کی فکر کرے، اپنی اولاد پر نگاہ رکھے، ان کی ایسی تربیت کی کوشش کرے جیسی اسلام چاہتا ہے، ہمارا ماحول یہ ہے کہ معاشرے کی بڑھتی ہوئی برائیوں کو دیکھ کر پریشانی کا اظہار تو کرتے ہیں، ان کی وجہ سے ہمارے چہروں پر فکر وتشویش کے آثار تو ضرور نظر آتے ہیں، لیکن جب اس کے لیے عملی طور پر قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو اس سے یکسر چشم پوشی کر جاتے ہیں، حالانکہ کم از کم اتنا تو ہر شخص کر سکتا ہے، کہ اپنی اولاد اور اپنے بچوں کو برے کام سے روک سکتا ہے اور بھلی بات کا حکم دے سکتا ہے، اگر اتنا بھی مسلمانوں کو احساس ہو جائے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ہماری حالتوں کو بدل دے گا، اور ہم اس وقت جو معاشرتی اور معاشی لحاظ سے تباہی وہلاکت کے دہانے کے قریب ہوتے جارہے ہیں، اس سے کچھ نجات ملنے کی امید نظر آنے لگے گی۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۃ التکویر

کاہن کی حقیقت اور شبہہ کہانت کا رد:

کاہن کی حقیقت یہ ہے کہ بعض انسانوں کو شیطانوں کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے، وہ شیاطین چوری چھپے آسمان میں فرشتوں کی مجلس میں پہنچ جاتے ہیں، اور فرشتوں کی مجلس میں آئندہ ہونے والے امور کی تدابیر کے متعلق گفتگو ہوتی ہے، وہ شیاطین اس گفتگو کو چوری چھپے سن کر آ کر اس اپنے دوست انسان کے کان میں ڈال دیتے ہیں، پھر وہ آدمی لوگوں کے سامنے آئندہ ہونے والے کسی کام کی خبر دیتا ہے، بعض اوقات وہ خبر اسی طرح ہو جاتی ہے جیسے اس نے دی تھی، شیاطین کا یہ معاملہ انسانوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بہت رائج تھا، اس فن میں اس زمانے کے بعض لوگ بہت مشہور ہوئے، جیسے شق، اور سطیح وغیرہ، ان کے عجیب وغریب قصے غیب کی خبروں کے سلسلے میں مشہور ہیں۔

آنے والی دونوں آیتوں میں اس شبہے کا رد کیا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ کاہن کا علم، غیب کی تمام اقسام کو محیط نہیں ہوتا، وہ تو مستقبل قریب میں ہونے والی بعض ان باتوں کی خبر دیتا ہے، جن باتوں کا فرشتوں کی مجالس میں کبھی اس وجہ سے تذکرہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو روبہ عمل لانے کا حکم فرشتوں کو دیا ہوتا ہے، اور شیاطین فرشتوں کی اس گفتگو کو چوری چھپے سن کر کاہن تک رمز واشارے کے طور پر پہنچا دیتے ہیں، اور کاہن بھی آگے رمز واشارے سے ہی بیان کرتا ہے، تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا اور شیاطین چونکہ پوری بات سن یا سمجھ نہیں پاتے اس لیے کچھ اشارے اس تک پہنچاتے ہیں، اور اس میں اپنی طرف سے بہت سا جھوٹ بھی ملا لیتے ہیں، اسی طرح کاہن بھی اس رمز والی بات کے اندر اپنی طرف سے قیاس آرائی کر کے بہت سی باتیں اضافہ کر دیتا ہے، اسی لیے اس کی بہت سی باتیں اور پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں، البتہ بعض اوقات تکا لگ بھی جاتا ہے، اس کے علم

کی بنیاد فرشتوں کی مجالس کی گفتگو ہے جو قریب زمانے میں واقع ہونے والے بعض جزوی واقعات سے متعلق ہوتی ہے، اس کے پاس کلی علم نہیں ہوتا۔

چنانچہ کاہن سے اللہ کے ناموں اور صفاتِ غیبیہ کے بارے میں پوچھا جائے، یا احکامِ شرعیہ کے متعلق جو ابھی پردۂ غیب میں ہیں اور جنت وجہنم کے احوال کے متعلق، یا مذاہب وملل کے حق وباطل ہونے کے متعلق، یا یہ کہ موت کے بعد ارواح کو کیا حالات پیش آتے ہیں، یا پہلے زمانے کے لوگوں کی تاریخ پوچھی جائے، تو وہ بالکل لاجواب ہو جائے اور خاموش رہ جائے۔

اس کے مقابلے میں قرآن کو دیکھو وہ تمام فنون غیب سے لبریز ہے، اگلوں پچھلوں کی خبریں اس میں، جنت ودوزخ اور دیگر مستقبل کے امور غیبیہ اس کے اندر موجود ہیں لہٰذا کہانت کو اس سے کیا نسبت ہے۔

وَمَاهُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۝

اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں

انسان کو معاش ومعاد، اور علم وعمل کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے، وہ سب اس کے اندر موجود ہیں، لہٰذا ایسا کلامِ حق جو سراسر ارشاد وہدایت ہے اس کے متعلق کہانت کا شبہہ کرنا زرباف وبوریاباف کے قصے کی طرح ہے۔

دوسری بات یہ ہے کاہن کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ سخنِ شیطانی ہوتا ہے جو فرشتوں کی مجلس سے چرایا جاتا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۝

اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا

کیونکہ شیطان آدم علیہ السلام کی تعظیم نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا، اس کے بعد اس کو حضرت آدم اور ان کی اولاد سے کمال درجے کی عداوت ودشمنی پیدا ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی عداوت وبغض اس کے دل میں پیدا ہوگیا۔ لہٰذا اب ذرا غور کرو کہ قرآن میں تو اللہ کی توحید، اس کی صفات اور

شرک کی مذمت کا بیان ہے اور انسانوں کے لیے ہدایات، اوامر، نواہی، جنت کا تذکرہ وترغیب، جہنم کا تذکرہ وترہیب، اور نیک اعمال کی تعریف، اعمالِ خیر میں مجاہدہ ومشقت کرنے کی ترغیب وتعریف ہے، بتوں کی مذمت، برے اعمال کی مذمت اور نفسانی ترغیبات کی مذمت ہے، نیک لوگوں، انبیاء وصلحاء کی تعریف ہے اور فرعون صفت بدکاروں کے انجام بد کا ذکر ہے۔

بھلا شیطان کا ان تعلیماتِ خیر سے کیا تعلق، یہ چیزیں تو اس کے جگر کا کانٹا ہیں، اس کے ہر کام کی تہہ میں آدم دشمنی پوشیدہ ہوتی ہے، اس لیے اس کا کام تو گمراہ کرنا اور بہکانا ہے، جب کہ قرآن میں شیطان کی اور اس کی پیروی کرنے والوں کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، شیطان تو ایسی باتوں کو سن کر کانوں میں انگلیاں ڈال کر بھاگتا ہے ع

دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآں بخوانند

اب ایسے کلام ہدایت کو شیطان کا کلام سمجھنا پرلے درجے کی حماقت ہے، چنانچہ کافروں کے اسی فاسد وباطل خیال پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ڈانٹتے ہیں:

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ۝

پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو

''کدھر جا رہے ہو'' اور کن خیالوں میں سرگرداں ہو؟ ایک سچی بات جو حقیقت ہے اس کو چھوڑ کر ایسے بودے احتمالات کی طرف توجہ کرتے ہو جو ناممکنات میں سے ہیں، ان سے کوئی فریب کھا سکتا ہے جس پر بچے بھی تمسخر اڑائیں؟ گویا تم لوگ گھر کی راہ بھول کر کنویں میں گرتے ہو۔

''ضنین'' کی قرأت میں قرا کا اختلاف:

اکثر معتبر قراء نے ''ضنین'' کو ضاد کی بجائے ظاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ''ظنین'' ظنین بالظاء کے معنی ہیں متّہم، اس صورت میں ''وماھو'' میں ''ھو'' ضمیر راجع ہوگی ''صاحبکم'' کی طرف، اب ترجمہ یوں ہوگا ''اور تمھارا پیغمبر غیب پر متہم نہیں ہے''، یعنی اس پر یہ تہمت نہیں لگائی جاسکتی کہ غیب کی باتیں اپنی طرف سے بیان کرتا ہے، اس لیے جب تم اس کو معمولی باتوں میں جھوٹا نہیں کہتے تو اس عظیم الشان معاملے میں اس پر جھوٹ کی تہمت کیسے لگائی جاسکتی ہے۔

یہاں سے اس شبہے کا ازالہ بھی ہوگیا کہ پیغمبر علیہ السلام نے جبرئیل کو اصلی شکل کے اندر دیکھنے میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے، العیاذ باللہ۔

''ضاد'' اور ''ظاء'' کے مخرج کا فرق:

''ضاد'' اور ''ظاء'' کے مخرج کے درمیان فرق کرنا بہت مشکل ہے، اس ملک (ہندوستان) کے رہنے والے اکثر لوگ ان کے مخرج میں فرق نہیں کرتے، دونوں کو یکساں نکالتے ہیں، ''ضاد'' کو صحیح طرح اس کے اپنے مخرج سے نہیں نکالتے اور نہ ہی ''ظاء'' کو اس کے اپنے مخرج سے نکالتے ہیں، قرآن پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے مخرج کو پہچانے اور مخرج صحیح سے ان کو نکالے۔

''ضاد'' کا صحیح مخرج:- زبان کی جڑ کا دایاں طرف یا بائیں طرف کو ڈاڑوں کی جڑ کے ساتھ لگا کر ضاد ادا کیا جاتا ہے ان داڑوں کو اضراس کہتے ہیں۔

''ظاء'' کا مخرج:- ظاء زبان کے اگلے کنارے کو سامنے کے اوپر کے دانتوں کی جڑ میں لگانے سے نکلتا ہے، ان دانتوں کو ثنایا علیا کہتے ہیں، دال، اور تاء کا مخرج بھی یہی ہے۔

''فلا أقسم'' کا جوابِ قسم:

اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ ''انہ لقول رسول الخ'' ''فلا اقسم'' کا جواب قسم ہے، اس کے مضمون کو مقسم علیہ قرار دیا ہے، یعنی قرآن کے کلام اللہ ہونے پر قسم کھائی گئی ہے۔

فاء تعقیب میں نکتہ:

لیکن یہ قسمیں جو ''فلا اقسم'' کی فاء کا مدلول ہیں، ان کو سابقہ مضمون کی تعقیب میں لانے کی وجہ واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی، اس میں کچھ خفاء ہے، البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اعمال کی جزاء کے انکشاف کو ان بارہ اسباب وحوادث پر معلق کیا جو سورت کی ابتداء میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان حوادث کے وقوع سے پہلے پہلے کچھ تدبیر کر لینی چاہئے اور یہ تدبیر جب تک خود اللہ تعالیٰ نہ بتائیں کسی کی سمجھ میں آنا ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ بتائیں بذریعہ وحی ہی بتلاتے ہیں، اور یہ قرآن وہی وحی ہے جو تدبیر بتلانے کے لیے آئی ہے، لہٰذا قرآن کے مضامین کے صحیح ہونے پر قسم کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ لوگ اس قرآن کے مطابق زندگی گزاریں اور قیامت کے دن ان کو کوئی حسرت وندامت نہ ہو۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مضمون کے درمیان مناسبت کی عجیب تقریر:

اب ہم آتے ہیں اس بات کی طرف کہ ان قسموں کی مناسبت آئندہ مضمون سے کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا، لوٹنا اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے پہلے انبیاء پر بار بار وحی آنے اور ایک مدتِ دراز تک اس کے نشان باقی رہنے پھر منقطع ہو کر چھپ جانے اور غائب ہو جانے کا، اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر گزرا کہ کسی شخص کو حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی، اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے، اس کے بعد صبح صادق کا دم بھرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس جہاں میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے، کہ ہر چیز کو ہدایت کے نور سے دن کی طرح روشن کر دیا، گویا پہلے انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نورِ اعظم کو آفتابِ درخشاں کہنا چاہئے، اور کیا ہی خوب کسی نے کہا ہے ؎

فإنه شمس فضل هم كواكبها

يظهرن أنوارها للناس في الظلم

حتىٰ إذا طلعت فى الكون عم هداها

للعالمين وأحيت سائر الأمم

قرآن کی سچائی کے بیان اور مخالفین کے بے بنیاد الزامات کی تردید کے بعد اب قرآن کی تھوڑی سی خوبیاں ''حصر'' کے طور پر بیان فرما رہے ہیں، حصر کا مطلب یہ ہے کہ اس میں صرف خوبیاں ہی ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اس کے بارے میں خوبی کے اعتقاد کے سوا کسی دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۝

یہ تو ایک نصیحت ہے جہان بھر کے واسطے

چونکہ قرآن اسماءِ باری تعالیٰ، صفات الٰہیہ پر مشتمل ہے اور یہ اللہ کے قرب اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، اس لیے اس کو نصیحت کہا ہے۔

''**للعالمين**'' تمام جہانوں سے مراد انسان، جن اور فرشتے ہیں، اس لیے کہ نصیحت کا فائدہ جہاں بھر میں صرف انہی تین طبقوں کو ہوتا ہے۔

انسان اور جنات قرآن سے نصیحت بھی پکڑتے، گناہوں سے بھی بچتے اور تلاوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قربِ معنوی بھی حاصل کرتے ہیں اور فرشتے بھی اس کی تلاوت سے انس رکھتے، دور دراز سے اس کے سننے کو آتے ہیں اور اس کے حروف وکلمات کی خدمت کرتے ہیں کہ ان کو آسمان پر لے جاتے اور مقبولیت کے مقام تک پہنچاتے ہیں، یہ سب باتیں ان کے لیے اللہ کے نزدیک قرب کی زیادتی کا ذریعہ ہیں۔

لیکن قرآن کے یہ فوائد مخصوص لوگوں کو ہی حاصل ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ۝

جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے

یعنی قرآن نصیحت اس شخص کے لیے ہے جو سیدھا چلتا ہے، اور جو کج روی اختیار کرے تو قرآن اس کو بجائے فائدہ دینے کے اس سے اس کا دل مزید سخت ہو جائے گا، جس کے بعد وہ نصیحت سے دور بھاگے گا اور اللہ سے سرکشی اور دوری اختیار کرے گا۔

قرآن کی مثال اس غذائے لطیف کی ہے جسے کوئی صحت مند بدن استعمال کرے تو اس کو قوت وتوانائی کے کمال تک پہنچادے، اور نقص وخرابی والے بدن کو کھلائی جائے تو نقص وبیماری میں مزید اضافہ کرے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے **"فی قلوبھم مرض فزادھم اللّٰہ مرضا"** اور فرمایا **"واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسا إلی رجسھم"**

مرضِ روحانی کی غذاء اور دواء:

اسی لیے محققین نے کہا ہے کہ قرآن مجید، نورِ پیغمبر، صحبتِ اولیاء اور علماء کا وعظ ونصیحت یہ سب مذاہب کی تکمیل وحفاظت کے لیے غذاء کی طرح ہیں، جہل وگمراہی کے مرض کے لیے دواء نہیں ہیں، اس کی دواء اور چیز ہے یہ چیزیں نہیں ہیں، اگر یہ چیزیں جہالت وگمراہی کے مرض کی دواء ہوتیں تو آج دنیا میں کوئی شخص جہالت وگمراہی میں گرفتار نہ ہوتا، سب ہی اچھے ہو جاتے، اب اس چیز کو بیان کرتے ہیں جو دواء ہے کہ وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے، چنانچہ فرمایا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

اور تم جب ہی چاہو کہ چاہے اللہ

یعنی علم وعمل میں سیدھا چلنے کی چاہت تمھارے اندر اسی وقت پیدا ہوگی جب اللہ چاہے گا، کیونکہ تم اس کے قبضۂ قدرت میں مجبور ہو اور تمہارا ارادہ اس کے ارادے کے تابع ہے۔

انسان کے اختیار کی حقیقت:

تمہارا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تابع ہے جیسے بازی گر جو پتلیوں، مورتیوں کا تماشا دکھانے والا ہوتا ہے، کہ پتلیاں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں ان کے حرکات بازی گر کے ہاتھ کی حرکت کے تابع ہوتی ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیار وارادے سے تمہارے اندر ارادہ اور اختیار پیدا کرتا ہے، پھر تم اپنے ارادہ واختیار کے موافق عمل کرتے ہو، اس پر تم ثواب یا عذاب کے مستحق ہوتے ہو۔

اور بازی گر ان پتلیوں کے اندر ارادہ واختیار پیدا نہیں کر سکتا وہ صرف حرکت دے سکتا ہے، اسی لیے پتلیوں کے کام بازیگر کی طرف منسوب ہوتے ہیں، ان کے کام وتماشا کی خامی یا خوبی ان کی طرف منسوب نہیں ہوتی بازیگر کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن اس کے مقابلے میں انسان جو اپنے اختیار وارادہ سے کام کرتے ہیں اس کام کی اچھائی یا برائی انسانوں کی طرف ہی منسوب کی جاتی ہے، اور وہی ثواب یا سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عقلاء نے کہا ہے کہ فعل اور اس کے سبب کے درمیان فاعلِ مختار کے واسطہ بن جانے کی وجہ سے فعل کا تعلق سبب سے منقطع ہو جاتا ہے، یعنی فعل کی نسبت سبب کی بجائے فاعل مختار کی طرف کی جاتی ہے، چنانچہ دنیوی امور کی تدابیر میں غلطی یا درستگی کی نسبت کام انجام دینے والے کی طرف کی جاتی ہے، مشورہ دینے والوں کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جاتی، یوں نہیں کہا جاتا کہ فلاں کام فلاں، فلاں نے (جنھوں نے مشورہ دیا تھا) غلط کیا، بلکہ یوں کہا جاتا ہے فلاں آدمی نے یہ کام غلط کیا، یعنی جس نے عملاً وہ کام کیا ہوتا ہے، اسی طرح سب کاموں میں یہ قاعدہ جاری ہے۔

باوجود اس کے کہ ہدایت کو اپنی مشیت کے ساتھ بعض افراد کے لیے خاص کیا ہے، مگر اس کی

ربوبیت تمام جہاں والوں کے لیے بحال و برقرار ہے اس لیے کہ اس کی صفت ہے رب العالمین چنانچہ فرمایا:

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سارے جہان کا مالک

اس کی رضامندی اس کی فرمانبرداری میں ہے، اور اس کی ناراضگی اس کی نافرمانی میں ہے، تا کہ مختلف عالموں کا ربط ایک دوسرے کے ساتھ درہم برہم نہ ہو جائے، یعنی گنہگاروں کے ساتھ بھی فرماں برداروں کی طرح راضی رہتا، ان پر ناراض نہ ہوتا تو اس کے قہر و سیاست، حکمت و عدالت کا عالم جس کا مظہر دوزخ اور اس کے طبقات ہیں بے کار رہ جاتا۔

اور اگر فرماں برداروں کو لطف و کرم سے نہ نوازتا، جنت کی نعمتیں ان کو عنایت نہ کرتا، تو اس کا عالمِ لطف و قدر دانی جس کا مظہر جنت، اس کے درجات اور حور و غلمان ہیں سب بے کار رہ جاتا۔

تم تفسیر سورة التکویر

بفضل اللّٰہ تعالیٰ والحمدللّٰہ اولاً و آخراً

☆☆☆☆☆☆☆

استاد کے ساتھ عقیدت

حضرت میرزا جان جاناں نے علم حدیث کی سند حضرت حاجی محمد افضل سے حاصل کی تھی، میرزا صاحب کا بیان ہے کہ تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد حضرت حاجی صاحب نے اپنی کلاہ جو پندرہ برس تک آپ کے عمامہ کے نیچے رہ چکی تھی، مجھے عنایت فرمائی، میں نے رات کے وقت گرم پانی میں وہ ٹوپی بھگو دی، صبح کے وقت وہ پانی املتاس کے شربت سے بھی زیادہ سیاہ ہو گیا تھا، میں اس کو پی گیا، اس پانی کی برکت سے میرا دماغ ایسا روشن اور ذہن ایسا رسا ہو گیا کہ کوئی مشکل کتاب مشکل نہ رہی۔ (مقامات مظہری ص ۲۹)

(اہل دل کی دل آویز باتیں ص ۴۵)

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مجیب صاحب کو اس مقام پر اپنی اس ''تحقیق'' کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے جو صفحہ ۱۳۹ سے ظاہر ہوتی ہے اور اس ''تحقیق'' کی رو سے جب تک دس بیس صحابہ کا واقف ہونا بسند صحیح نہ بیان کریں گے غلط بیانی کے جرم سے براءت نہیں ہوسکتی۔ اب مجیب صاحب کی پہلی وجہ سنیے لکھتے ہیں کہ نہ ٹوکنے کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ یہ اجتہادی مسئلہ تھا اور خلیفۂ وقت کی مخالفت مناسب نہ سمجھی (آثار ص ۳۸)

معلوم ہوتا ہے کہ مجیب صاحب یہ جانتے ہی نہیں کہ اجتہادی مسئلہ کس کو کہتے ہیں ''حضرت مولانا'' جب آپ یہ کہتے ہیں کہ تین کا ایک ہونا صریح نص وتقریر نبوی سے ثابت ہے اور تین کے تین ہونے پر کوئی نص یا تقریر نبوی نہیں ہے، تو یہ مسئلہ اجتہادی کیونکر ہوا۔ ہاں اگر یہ کہتے کہ اس مسئلہ میں دونوں جانب متعارض نصوص موجود تھے اور حضرت عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے وقوع ثلاث کی تصریح کو ترجیح دیا۔ یا کسی جانب کوئی نص صریح موجود نہ تھی اور حضرت عمرؓ نے کسی غیر صریح نص سے وقوع ثلاث کو مستنبط کیا، تو بے شک یہ مسئلہ اجتہادی ہوسکتا ہے، لیکن پھر بھی صحابہ کا سکوت وعدم مخالفت حضرت عمرؓ کی موافقت پر دلالت کرے گا، اس لیے کہ اگر ان کی نظر میں حضرت عمرؓ کا استنباط یا ترجیح غلط تھی، تو ان کو خاموش رہنا کسی طرح مناسب نہ تھا، اور کیا یہ آپ کے نزدیک کتمان علم نہیں ہے جس پر وعید آئی ہے؟

میں پوچھتا ہوں کہ جب یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور کوئی شخص وقوع ثلاث کا فتویٰ یا حکم دے تو عہد نبوی کے حکم کو جانتے ہوئے خاموش رہنے میں کوئی گرفت نہیں ہے، تو کیا وجہ ہے کہ جب کوئی حنفی مفتی کسی حنفی مرد اور عورت کو وقوع ثلاث کا فتویٰ دیتا ہے تو آپ لوگ اس کی مخالفت میں فتوے لکھتے ہیں اور بے وجہ فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں، کیوں نہیں انھیں صحابہ کی روش پر چلتے ہوئے خاموشی اختیار

کرتے؟ اگر اظہار حق واتباع سنت کا حیلہ پیش کیجئے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ صحابہ اظہار حق واتباع سنت میں آپ لوگوں سے بہت کم تر درجہ رکھتے تھے اور ان کو ان باتوں کا خیال نہ تھا۔ (استغفر اللہ) سوچ سمجھ کر جواب دیجئے اور ثابت کیجئے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور اجتہادی مسئلہ میں مخالفت نہ کرنے پر کوئی گرفت نہیں ہے، ہاں یہ بھی اعلان کیجئے کہ اس مسئلہ میں کوئی حدیث نہیں ہے، پس جس نے مسلم اور مسند احمد کی حدیث پیش کی ہے اس نے غلطی کی ہے اور جس نے حمایت کی ہے اس نے ناجائز حمایت کی ہے۔

دوسری وجہ مجیب نے یہ ذکر کی کہ ''صحابہ حضرت عمر کی مخالفت سے خائف رہتے تھے......اس وجہ سے مخالفت نہ کی''

اس کا جواب باب سوم میں آئے گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ:

''تعزیری امور میں ۔۔۔۔ کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا''

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ تعزیری وسیاسی امر نہیں ہے جیسا کہ بحث اجماع میں بتایا گیا۔
ثانیاً:- اس کا کیا ثبوت ہے کہ تعزیری امر میں امیر المومنین پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہوتا۔
ثالثاً:- اعتراض کا حق نہ ہونے سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ غلطی کا شبہ بھی نہ کیا جائے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ:

''جملہ صحابہ کا موجود ہونا جب تک ثابت نہ ہو مخالفت یا عدم مخالفت کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتی (آثار ص ۳۸)

مجیب صاحب اولاً یہاں اثر انداز ہونے سے بحث نہیں ہے، بلکہ اس سے بحث ہے کہ کسی نے مخالفت کی یا نہیں؟ اگر نہیں کی تو کیوں؟ افسوس ہے کہ اتنی معمولی بات بھی آپ کے سیاسی دماغ میں نہیں سماتی۔

ثانیاً:- اثر انداز ہونے کا انکار بھی غلط ہے، اس لیے کہ ہم کو معلوم ہے کہ ایک ایک صحابی کی مخالفت بھی اثر انداز ہوگئی ہے، اور اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ جب تک سب صحابہ موجود ہو کر ترک مخالفت نہ کریں اجماع کا ثبوت نہیں ہو سکتا، تو گزارش ہے کہ یہاں اجماع کی گفتگو نہیں ہے، میری

عبارت پڑھیے، علاوہ بریں اس صورت میں ''مخالفت'' کی شق کا ذکر غلط ہے۔

ثالثاً: - اثر انداز نہ ہونا ترکِ اظہارِ حق کا عذر نہیں بن سکتا۔ مانا کہ مخالفت کا کچھ اثر نہ ہوتا، لیکن جو صحابہ موجود تھے ان کا فرض تھا کہ حکم نبوی جو ان کو معلوم تھا بتا دیتے، اگر مجیب صاحب کی نظر قرآن کریم پر ہوتی تو یہ لغوبات وہ نہ لکھتے۔

مخالفین کی پہلی دلیل یعنی حدیث مسلم کی بحث ختم ہو چکی، اب آگے دوسری دلیل یعنی حدیث مسند احمد کی بحث ہے لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے مختصراً یہ بتا دینا مناسب ہے کہ مخالفین کی پہلی دلیل جس کو وہ بڑے تمکنت سے پیش کرتے ہیں اس کا حال یہ ہے کہ مشہور ائمۂ اسلام اس کو صورت نزاعیہ میں استدلال کے قابل نہیں سمجھتے، امام احمد، امام شافعی، امام طحاوی، امام بیہقی، امام ابوداؤد کے خیالات آپ معلوم کر چکے، اور امام اسحاق بن راہویہ (استاذ امام بخاری) اور زکریا ساجی اور ایک جماعت نے اس حدیث کو غیر مدخولہ پر محمول کیا ہے۔ اور امام ابن سریج (شاگرد امام شافعی) نے اس صورت پر حمل کیا ہے جو نووی نے ذکر کی ہے اور امام ابوزرعہ رازی (جن کا ذکر مجیب نے آثار ص۱۴ میں کیا ہے اور جن کو امام مسلم نے اپنی صحیح دکھا کر معلول حدیثیں حذف کی ہیں) نے فرمایا ہے کہ عہد نبوی وعہد صدیقی میں تین ایک تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ عہد نبوی وصدیقی میں بجائے تین کے ایک ہی طلاق دی جاتی تھی۔ اور ابن حزم وابن المنذر اس کو مرفوع ہی نہیں مانتے۔ ان کے علاوہ ابن عبدالبر یا ابن العربی، باجی، قرطبی، امام نووی، اور حافظ ابن حجر کے خیالات بھی آپ سن چکے ہیں۔

اب ناظرین خود انصاف کریں جب یہ ائمہ وعلمائے حدیث وفقہ حدیث مسلم کو منسوخ یا شاذ یا ماٗول وغیرہ کہتے ہیں اور صورت نزاعیہ میں استدلال کے قابل نہیں سمجھتے، پس اگر اس حدیث کی نسبت ان حضرات کا قول نا قابل تسلیم ہے تو پھر کسی حدیث کی صحت وسقم یا کسی حدیث کے معنی ومراد میں ان کا قول نہیں مانا جا سکتا۔

دوسری حدیث

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

دوسری حدیث مسند احمد کے حوالہ سے ذکر کی جاتی ہے، اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ ''حضرت رکانہ اپنی بی بی کو تین طلاق دے کر بہت پچھتائے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیسی

طلاق دی ہے، انھوں نے کہا تین، آپ نے پوچھا کہ ایک جلسے میں؟ کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ہی ہے، اگر تمہارا جی چاہے تو رجعت کرلو"۔

صاحب آثار نے پہلے اس حدیث کو مسند احمد سے نقل کیا ہے، اس کے بعد میں نے جو کلام اس حدیث پر کیا ہے اس کی تنقیح کی ہے، اور انھیں تنقیحات کو میرے اعتراضات قرار دے کر جواب دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

مولف کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ حدیث معلول ہے آپ نے ......ایک عجیب انداز میں معلول کی تعریف بھی کی ہے...... جو یہ ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی حدیث کی اسناد بہت ٹھیک ہوتی ہے لیکن اس کے مضمون میں کوئی ایسی باریک علت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ نامقبول ہوجاتی ہے، ایسی حدیث کو اصطلاح میں معلول کہتے ہیں انتہی۔

ناظرین غور فرمائیں کہ یہ تعریف دو جزء پر مشتمل ہے، اول یہ کہ حدیث معلول کی سند بہت ٹھیک ہوتی ہے...... دوم یہ کہ مضمون میں کوئی باریک علت ہوتی ہے...... اب سوال یہ ہے کہ جب مولف کے نزدیک اس حدیث کی سند صحیح ہو تو تیسرا اور چوتھا اعتراض باقرار مولف غلط ہے یا نہیں (آثار ص ۳۹)

جواب: – سب سے پہلے میں ناظرین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجیب صاحب نے میرے کلام کی تنقیح کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ میں نے ان کے خیال میں بعض اعتراض پر بے کار صفحہ کا صفحہ سیاہ کرڈالا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی اعتراض میں کوئی بے کار بات نہیں لکھی، اصل یہ ہے کہ اگر مجیب صاحب سلسلہ وار میری پوری پوری عبارت نقل کرکے جواب دینا چاہتے تو ان کی ملمع کاریاں ہر عامی اور جاہل پر بھی کھل جاتیں اور اپنی شہرت کا جو خواب وہ دیکھ رہے تھے منت کش تعبیر نہ ہوتا۔ اس لیے کہیں کہیں سے کوئی کوئی فقرہ لے کر آپ نے اس کا نام تنقیح رکھا اور سیاق وسباق سے بالکل بے نیاز ہوکر بریلویانہ رنگ میں ان فقروں کا جواب دے کر معتقدین پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کی۔ میرے اس بیان کی تصدیق مطلوب ہو تو ناظرین آثار ص ۱۱ سطر ۱۸ میں بنارسی فتوے کا یہ فقرہ پڑھیں کہ "یہ حدیث حسن اور صحیح دونوں طریق سے مروی ہے" اس کے بعد اعلام مرفوعہ ص ۱۷ کی سترہویں سطر سے ص ۱۸ کی چوتھی سطر تک پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ میرے کلام کی بنا بنارسی

فتوے کے منقولہ بالا فقرہ کے جواب سے ہوتی ہے چنانچہ میرا پہلا فقرہ یہ ہے:
''کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث حسن وصحیح دونوں طریق سے مروی ہے مگر درحقیقت یہ مغالطہ ہے''
(اعلام ص ۱۷)

اور اسی سلسلہ میں میں نے حافظ ابن حجر کا اس حدیث کو معلول کہنا، اور حافظ ذہبی کا اس کو مناکیر میں شمار کرنا بھی دکھایا ہے، اور چونکہ بنارسی نے مذکورہ بالا فقرہ اعلام الموقعین کے حوالہ سے لکھا ہے، اس لیے میں نے اعلام الموقعین کی بات کا بھی اس سلسلہ میں جواب دیا ہے۔

مجیب نے صرف اتنی بات لے لی کہ مولف اعلام نے اس حدیث پر معلول ہونے کا اعتراض کیا ہے، لیکن یہ نہ بتایا کہ میں نے کس سلسلہ میں یہ لکھا ہے اور اس کے آگے پیچھے کیا ہے، جس کی وجہ سے ابلہ فریبی کا ان کو خوب موقع ملا ہے۔

چنانچہ پہلی ابلہ فریبی وغلط بیانی یہ ہے کہ مجیب نے میری خط کشیدہ عبارت سے یہ نتیجہ نکالا کہ ''میرے نزدیک حدیث مسند احمد کی سند صحیح ہے اور اس کا کوئی راوی مجروح نہیں ہے'' حالانکہ میں نے حدیث مسند احمد کی نسبت ہرگز یہ بات نہیں لکھی ہے، میں نے تو ایک عام بات لکھی ہے کہ:
''بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی حدیث کی اسناد بہت ٹھیک ہوتی ہے لیکن اس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہوتی ہے''۔

اس سے یہ کس طرح نکلتا ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حدیث مسند میں بھی ہے۔ اگر کہیے کہ جب تمھارے نزدیک حدیث مسند میں یہ بات نہیں ہے تو تم نے اس بات کا یہاں ذکر ہی کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے ابن القیم اور بنارسی کی غلط بات کو تھوڑی دیر کے لیے صحیح فرض کر کے یہ بتایا ہے کہ اگر اسناد صحیح یا حسن بھی ہو تو اس سے حدیث کا قابل استدلال ہونا لازم نہیں آتا جب تک کہ متن بھی علت سے خالی نہ ہو۔ چنانچہ میری چند عبارتوں میں اس کی تصریح موجود ہے، ملاحظہ ہو، عبارت نمبر ۱:

''حافظ ابن حجر نے......فرمایا ہے **وھو معلول ایضاً** ......اور ذہبی نے اس کو......مناکیر میں شمار کیا ہے، پس اس حالت میں اگر اس کی اسناد حسن یا صحیح بھی ہو تو استدلال نہیں ہوسکتا'' (اعلام ص ۱۸ و آثار ص ۳۸)

عبارت نمبر۲ ''پس اگر اس حدیث کی اسناد صحیح بھی ہو تو چونکہ حافظ ابن حجر نے اس کو معلول کہا ہے اس لیے اس سے استدلال جائز نہیں ہوسکتا'' (اعلام ص ۱۹)

عبارت نمبر۳ ''یہ سب اس وقت ہے جب کہ حدیث کی اسناد صحیح یا حسن تسلیم کر لی جائے لیکن ابھی اسی میں بہت گفتگو ہے کہ اسناد صحیح بھی ہے یا نہیں'' (اعلام ص ۱۹ و آثار ص ۴۳)

ان عبارات سے صاف واضح ہے کہ میں نے خط کشیدہ عبارت میں جو کچھ لکھا ہے وہ بر سبیل فرض اور تھوڑی دیر کے لیے مخالفین کی غلط بات کو صحیح مان کر لکھا ہے، جس سے کسی طرح نہیں ثابت ہوسکتا کہ میں بھی حدیث مسند احمد کی اسناد کو صحیح سمجھتا ہوں۔

مجیب کو علم سے علاقہ ہوتا اور اہل علم کے طرز گفتگو سے واقف ہوتے تو ہر فن کی کتاب میں ان کو اس کی نظیریں ملتیں، مگر وہ بے چارے معذور ہیں، بہر حال میری خط کشیدہ عبارت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ میں حدیث مسند کی اسناد کو صحیح سمجھتا ہوں، لہذا تیسرا اور چوتھا اعتراض بالکل درست ہے اور اس کو باقرار مولف غلط کہنا دوسری غلط بیانی وابلہ فریبی ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ تو نہیں ہوسکتا اسناد صحیح بھی ہو اور نہ بھی ہو، لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ صحیح تو نہ ہو لیکن کسی کی خاطر سے تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے۔

تیسری غلط بیانی وابلہ فریبی یہ ہے کہ میری خط کشیدہ عبارت کو حدیث معلول کی تمام قسموں کی جامع و مانع تعریف قرار دے کر یہ اعتراض کر بیٹھے کہ ''معلول کا اطلاق صرف اسی معنی پر ختم نہیں ہے'' (آثار ص ۴۰) حالانکہ معلول کی جامع و مانع تعریف کرنا تو کجا سرے سے تعریف ہی کرنا میرا مقصود نہ تھا، نہ میں نے یہ کیا، بلکہ میرا مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ صحت اسناد کے باوجود بھی ایک حدیث ناقابل استدلال ہوجاتی ہے، جب کہ اس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہو اور اس کو معلول کہتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اس کے علاوہ بھی کسی حدیث پر معلول کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں تو ضرور ہوتا ہے، مگر اس سے مجھ کو بحث نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے میں نے صاف صاف یہ لکھ دیا ہے کہ ''بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے'' یہ نہیں لکھا ہے کہ ہمیشہ معلول ہونے کی یہی صورت ہوا کرتی ہے۔ مگر مجیب صاحب نے اپنی دھن میں میرے ان الفاظ پر توجہ نہیں کی۔

چوتھی غلط بیانی وابلہ فریبی یہ لکھنا ہے کہ ''ابن حجر تو یہ کہیں کہ اس کی سند پر اعتراض ہے اور

مولف ان کے وکیل بن کر یہ کہیں کہ اس کی سند بہت ٹھیک ہے'' (ص ۴۰)

ناظرین کو اب تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ میں نے اس کی سند کو ہرگز ٹھیک نہیں کہا ہے، اب ذرا ایک بار ابن حجر کی عبارت جو میں نے اعلام ص ۱۸ میں اور مجیب نے آثار ص ۴۱ میں نقل کی ہے، اس کو پڑھیں اور بتائیں کہ ابن حجر نے کہاں سند پر اعتراض بتایا ہے، اگر مجیب صاحب یہ کہیں کہ اس عبارت میں تو نہیں لیکن دوسری کتاب کی ایک عبارت میں ابن حجر نے سند پر اعتراض بتایا ہے، تو عرض ہے کہ یہاں تلخیص کی عبارت میں گفتگو ہے، اس عبارت میں صرف سند پر اعتراض ہونے کی تصریح یا اشارہ کہاں ہے؟ باقی اگر کسی دوسری کتاب میں انھوں نے سند پر بھی اعتراض کیا ہے تو نور علی نور یہ میرے بیان کیے ہوئے مطلب کے خلاف کب ہے؟ تفصیل آگے آئے گی۔

پانچویں غلط بیانی وابلہ فریبی یہ ہے کہ ''مولف نے ابن حجر کی عبارت **وهو معلول أيضا** کا یہ مطلب بیان کیا کہ اس حدیث کی سند بہت ٹھیک ہے اور مضمون میں کوئی باریک علت ہے حالانکہ ابن حجر بلوغ المرام میں فرماتے ہیں...... کہ اس حدیث کی سند میں ابن اسحاق ہیں اور ان میں کلام ہے، اور فتح الباری میں اس علت کو ذکر کر کے جواب دیتے ہیں اور اس سند کو حسن کہتے ہیں...... ......اس غلط بیانی کی بھی کوئی حد ہے کہ قائل تو یہ کہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے معلول ہے اور مولف یہ کہیں کہ متن کے اعتبار سے معلول ہے'' (مختصر آثار ص ۴۰)

ناظرین خط کشیدہ عبارت کو یاد کر لیں اور اعلام میں دیکھیں کہ میں نے **وهو معلول أيضاً** کا یہ مطلب کہاں لکھا ہے۔

میں نے تو اس عبارت کا مطلب یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث بھی بہت ضعیف ومجروح ہے اور لطف یہ ہے کہ مجیب بھی میرے اس بیان کیے ہوئے مطلب کو آثار ص ۳۸ میں نقل کر چکے ہیں پھر نہ معلوم اس کذب وافترا سے کیا فائدہ۔

چھٹی غلط بیانی یہ ہے کہ انھوں نے خط کشیدہ عبارت کو میری طرف منسوب کیا، حالانکہ یہ عبارت میں نے اعلام میں کہیں بھی نہیں لکھی اور میں نے اس حدیث کی سند کو کہیں بھی بہت ٹھیک نہیں لکھا ہے، ناظرین مجیب صاحب کی اس سینہ زوری کو ملاحظہ کریں کہ ابھی ایک صفحہ پہلے وہ میری عبارت کس طرح نقل کر چکے ہیں اور یہاں آ کر اس کو کیا سے کیا کر ڈالا اور مزید لطف یہ ہے کہ وہاں

اس عبارت کو ''بعض اجلۂ علماء کی غلطی ظاہر کرنے کے لیے معلول کی تعریف'' لکھ چکے ہیں اور یہاں اسی کو محرف کر کے حافظ ابن حجر کی عبارت کا مطلب کہنے لگے۔

ساتویں غلط بیانی یہ لکھنا ہے کہ ''ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کی سند کو حسن کہتے ہیں'' اگر مجیب صاحب سچے ہوں تو فتح الباری کی عبارت جلد وصفحہ کے حوالہ کے ساتھ نقل کریں۔

آٹھویں غلط بیانی یہ فرمانا ہے کہ ''قائل تو یہ کہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے معلول ہے'' اس لیے کہ قائل سے مراد ابن حجر ہیں اور ابن حجر نے تلخیص میں صرف یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث معلول ہے اور اس کی کچھ تصریح نہیں کی ہے کہ سند کے اعتبار سے یا متن کے اعتبار سے۔ باقی رہا مجیب کا یہ اجتہاد کہ حافظ نے بلوغ المرام میں یہ لکھا ہے کہ ''اس حدیث کی سند میں ابن اسحٰق ہیں اور ان میں کلام ہے'' لہذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اس حدیث کو معلول کہنا اسی سند کی خرابی کی وجہ سے ہے تو یہ اجتہاد بالکل غلط ہے، اس لیے کہ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ تلخیص میں علت خفیہ کا ذکر کیا ہو اور بلوغ المرام میں ظاہری جرح کا اور مقصود یہ ہو کہ اس حدیث میں یہ دونوں عیب پائے جاتے ہیں۔

ابن حجر نے بلوغ المرام میں صرف سند ہی پر کلام نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اس سے بہتر طریق سے حدیث ابوداؤد کا حدیث مسند کے خلاف روایت کرنا بھی بتایا ہے۔ اور یہی علت خفیہ ہے، پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حجر اس حدیث کو مجروح السند اور معلول دونوں کہتے ہیں، جیسا کہ میں نے بھی لکھا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ بلوغ المرام کی مدد سے تلخیص کی عبارت کا یہ مطلب نکالنا کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے معلول ہے، کسی طرح صحیح نہیں، اس لیے کہ بلوغ المرام میں جس طرح سند کی خرابی کا ذکر ہے، اس طرح علت خفیہ کی تفصیل بھی ہے۔ مگر مجیب نے غایت دیانت داری سے بلوغ المرام کی اتنی ہی عبارت نقل کی جس سے سند کی خرابی ثابت ہوتی ہے اور باقی عبارت جس میں علت خفیہ کا بیان تھا، ہضم کر گئے۔

ثالثاً:- ظاہری جرحوں کی وجہ سے حدیث کو معلول کہنا قلیل ہے، جیسا کہ سخاوی نے فتح المغیث میں لکھا ہے، پس ابن حجر کے کلام کو بلا وجہ اس صورت پر حمل نہیں کیا جاسکتا۔

رابعاً:- فتح الباری میں مذکورہ بالا علت خفیہ کو ذکر کر کے لکھا ہے **وھو تفصیل قوی** یعنی یہ قوی تفصیل ہے۔ اور آگے لکھا ہے کہ اس نکتہ سے ابن عباس کی حدیث سے (جو مسند میں ہے)

استدلال رک جائے گا۔ اس تصریح سے ثابت ہوگیا کہ تلخیص میں ان کا اس حدیث کو معلول کہنا اسی علت خفیہ کی بنا پر ہے۔ لیجئے مجیب صاحب میں نے تصریح ہی پیش کردی ہے اور خود حافظ کے کلام سے باریک علت بھی بیان کردی، اب میرا آپ سے مطالبہ ہے کہ اس حدیث کو سند کے اعتبار سے معلول کہنے کی تصریح حافظ کے کلام سے پیش کریں۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''ایک مصری حنفی نے اسی بحث میں ایک رسالہ لکھا ہے......اور مولف کی ساری داد تحقیق اسی رسالہ کی رہین منت ہے، بلکہ بہت سے مقامات میں اسی رسالہ کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے یہ صاف لفظوں میں تشریح فرمادی ہے کہ اس حدیث کو سند کے اعتبار سے معلول کہا گیا ہے'' الخ (باختصار ص ۴۱)

جواب: -اگر میں نے اس رسالہ سے استفادہ کیا ہوتا تو یہ کوئی برائی نہ تھی نہ اس کا اعتراف کرنے میں میں اپنی کوئی توہین سمجھتا، لیکن واقعہ یہ ہے (**واللّٰہ علی ما نقول وکیل**) کہ میں نے اس رسالہ کی صورت بھی اب تک نہیں دیکھی ہے تا بہ ترجمہ ونقل چہ رسد۔ مجیب صاحب اس غلط بیانی وافترا کے جواب دہ خدا کے ہاں ہوں گے۔ یہاں پر میں اپنی صداقت کا کیا ثبوت پیش کرسکتا ہوں، ہاں قیامت میں اس کا فیصلہ ہوجائے گا۔ یہ تو مجیب کی پہلی غلط بیانی تھی۔

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ گو مصری صاحب کا رسالہ میں نے نہیں دیکھا ہے، لیکن ان کی جو عبارت مجیب نے نقل کی ہے اس میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ ''اس حدیث کو سند کے اعتبار سے معلول کہا گیا ہے'' بلکہ ان کا لفظ تو یہ ہے: **فانہ حدیث معلول بمحمد بن اسحاق و شیخہ الخ**، یعنی یہ حدیث ابن اسحاق اور ان کے شیخ کی وجہ سے معلول ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصری صاحب خود ایک حدیث کو ابن اسحاق اور ان کے شیخ کی وجہ سے معلول کہہ رہے ہیں۔ اور اگر بالفرض مصری صاحب نے یہ لکھا بھی ہو کہ اس حدیث کو سند کے اعتبار سے معلول کہا گیا ہے، تو ان کی عبارت سے یہ کیوں کر ثابت ہوتا ہے کہ ابن حجر نے سند کے اعتبار سے معلول کہا ہے۔ ممکن ہے ابن حجر کے علاوہ کسی اور نے سند کے اعتبار سے معلول کہا ہو اسی کو مصری صاحب نقل کررہے ہوں۔

بہر حال مجیب صاحب کو ثابت کرنا چاہئے کہ مصری صاحب نے ابن حجر کی عبارت کا یہ

مطلب کہاں بیان کیا ہے، اس لیے کہ ابن حجر کی عبارت میں گفتگو ہے۔

اس کے بعد مجیب نے تلخیص کی پوری عبارت نقل کر کے دو باتیں لکھی ہیں۔

ا:-**حدیث بتہ** کی تعلیل وتضعیف کو مولف کی دیانت ہضم کرنا چاہتی ہے۔

۲:-**حدیث بتہ** کا تعلق امام بخاری کی تعلیل اور محدثین کی ایک جماعت کی تضعیف کے مقابلہ میں ثلاثاً کی روایت کو ابن حجر کا ''یہ بھی معلول ہے'' کہنا کیا وقعت رکھتا ہے، خصوصاً جب کہ دوسرے مقام پر حافظ نے اپنے اعتراض کا خود ہی جواب دے دیا ہے۔ (آثار ص ۴۱ و ۴۲)

مجیب صاحب چاہتے ہیں کہ میں بھی بے عقلی کا مظاہرہ کرتا اور ثلاثاً والی کا ضعف ثابت کرنے کے اثنا میں یونہی بے موقع بتہ والی روایت کی تعلیل وتضعیف کا بھی ذکر کر دیتا۔ کوئی مجیب صاحب سے پوچھے کہ آخر آپ اس قدر حواس باختہ کیوں ہوئے جارہے ہیں، جہاں میں نے ثلاثاً والی روایت کی نسبت **وھو معلول** نقل کیا ہے، وہاں بتہ کی تضعیف نقل کرنے کا کون سا موقع ہے۔ علاوہ بریں حدیث بتہ کی تضعیف ہی کے متعلق آپ یہ کیوں لکھ رہے ہیں، ابن حجر نے حدیث بتہ کی ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم سے تصحیح بھی تو نقل کی ہے، آخر آپ کی دیانت اس کو کیوں ہضم کرنا چاہتی ہے، جس طرح حدیث بتہ کی تضعیف میں نے نقل نہیں کی اسی طرح اس کی تصحیح بھی یہاں تو نقل نہیں کی ہے، جس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ اس کا یہاں موقع نہیں۔

مجیب صاحب کی دوسری بات بھی سراسر کج فہمی کی رہین منت ہے، غور کیجئے کہ بخاری وغیرہ تو بقول مجیب حدیث بتہ کی تعلیل وتضعیف کر رہے ہیں۔ اور ابن حجر ثلاثاً والی کو معلول کہہ رہے ہیں۔ پس بخاری وغیرہ اور ابن حجر میں مقابلہ ہی کہاں ہے اور دونوں کی باتوں میں تعارض ہی کیا ہے جو آپ ترجیح دینے بیٹھ گئے، اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ بخاری فرمائیں کہ زید بیمار ہے اور ابن حجر کہیں کہ عمرو بھی بیمار ہے، اور مجیب صاحب یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں کہ بخاری کے مقابلہ میں ابن حجر کا قول کیا وقعت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ مجیب کا یہ فیصلہ سن کر ایک معمولی عقل کا انسان بھی بول اٹھے گا کہ جناب والا! بخاری وابن حجر کے قول میں تعارض ہی کہاں ہے جو آپ خواہ مخواہ یک طرفہ ڈگری دینے لگے۔

(جاری ہے)

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(آٹھویں قسط)

ناظرین سب سے پہلے اتحاد الفریقین کا صفحہ ۸۴ سامنے رکھ کر دیکھیں کہ شیعہ مصنف نے خطبہ کے آخری خط کشیدہ فقرے نقل نہیں کیے ہیں، اس لیے کہ ان فقروں کو سامنے رکھنے کے بعد ان سے پہلے کے فقروں کی مراد بالکل واضح ہو جاتی ہے، اور شیعہ مصنف کی فریب کاریوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔

شیعہ مصنف کہتا ہے کہ **انک لتعلم ما اعلم** وغیرہ میں مظالم عثمانی کا جاننا مراد ہے اور حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ بھی ان مظالم سے اسی طرح باخبر ہیں جس طرح ہم ہیں۔

اس کی نسبت پہلی گزارش یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے **ما اعلم** کی کوئی تعیین و تخصیص نہیں کی، تو شیعہ مصنف کو اس کی تعیین کا کیا اختیار ہے اور اس پر کیا دلیل ہے؟ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ کوئی تعیین نہ ہو۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ خطبہ کے آخری خط کشیدہ فقرے صاف بتا رہے ہیں کہ ان سے پہلے کے فقرے بھی حضرت عثمانؓ کی مدح میں ہیں، ورنہ حضرت علیؓ کے کلام میں اختلال و بے ربطی کا عیب پیدا ہو جائے گا، کہ مظالم عثمانی کا ذکر کرتے کرتے بالکل بے جوڑ ان کی صحبت رسول وغیرہ کا ذکر کرنے لگے اور ان کی صحبت کو بالکل اپنی صحبت رسول کے مماثل قرار دینے لگے[1]

(۱) ابن ابی الحدید زیدی شیعہ لکھتا ہے **فقال ما سبقناک الی الصحبة ولا انفردنا بالرسول دونک وانت مثلنا ونحن مثلک** شرح نہج البلاغۃ صفحہ ۴۸۲ ج ۲ یعنی علیؓ نے فرمایا کہ ہم صحبت میں آپ سے سبقت نہیں لے گئے۔ نہ ہم نے ہی تنہا رسول کی صحبت پائی بلکہ آپ ہمارے مثل اور ہم آپ کے مثل ہیں۔ ۱۲ منہ

باقی حضرت عثمانؓ وعلیؓ کے مساوات علمی کا استبعاد جن تخیلات کی بناء پر ظاہر کیا ہے، وہ تخیلات سرے سے فاسد و بے بنیاد ہیں، چنانچہ باب مدینۃ العلم کی حدیث کو متعدد محدثین اہلسنت نے موضوع کہا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ کا سرچشمہ علوم اولین وآخرین ہونا بھی صرف روافض کا ایک گندہ خیال ہے، مسلمان ایسی بات اپنے منھ سے نہیں نکال سکتا جس سے کسی نبیؑ کی اہانت ہوتی ہے، اور شیعوں نے یہ لکھ کر تمام انبیاء سے علیؓ کو بڑھا دیا ہے، اسی طرح یہ بھی جھوٹ ہے کہ علیؓ کے اعلم الناس بعد الرسول ہونے پر امت کا اجماع ہے، جس کے اعلم الناس بعد الرسول ہونے پر اجماع ہے وہ وہی ہے جس نے رسول کے بعد امت کی امامت کی، اور جس کی نسبت حدیث صحیح میں صحابہؓ کا یہ اعتراف موجود ہے **فكان أبو بكر أعلمنا** (ابوبکرؓ ہم امت محمدیہؐ) میں سب سے بڑے عالم تھے۔

اخیر اخیر میں خبیث مصنف نے جو خبیث لفظ حضرت عثمانؓ کے باب میں لکھا ہے اور اس کو اپنی بے ایمانی سے حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کیا ہے، اس کی نسبت بار بار علمائے اہلسنت لکھ چکے ہیں کہ یہ افسانہ بالکل جھوٹ ہے، چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تحفۂ اثناعشریہ میں لکھتے ہیں:

وتحریض نمودن عائشہؓ بر قتل عثمان و اورا نعثل گفتن ہمہ از مفتریات ابن قتیبہ وابن اعثم کوفی وسمساطی است وایں جماعۃ کذابان مشہور اند وواقعہ جمل ودیگر وقائع چیز ہا ذکر کردہ اند کہ باتفاق شیعہ وسنی افتراء محض وبہتان صرف است صفحہ ۶۴۸	حضرت عائشہؓ کا قتل عثمانؓ پر ابھارنا اور ان کو ان کا نعثل کہنا یہ سب ابن قتیبہ وابن اعثم کوفی وسمساطی کی گڑھی ہوئی باتیں ہیں اور یہ سب مشہور دروغ گو ہیں کہ جمل وغیرہ کے واقعات میں ایسی باتیں ذکر کی ہیں جو باتفاق فریقین جھوٹی ہیں۔

ابوالائمہ کی تعلیم میں حضرت علیؓ کا ایک خطبہ جس میں یہ فقرے قابل دید وشنید ہیں نقل کیا گیا ہے۔

وسيهلك في صنفان: محب مُفرِط يذهب به الحب الى غير الحق، ومبغض مُفرِّط يذهب به البغض الى غير الحق وخير الناس في حالاً	عنقریب میرے متعلق دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک محبت کرنے والا حد سے بڑھ جانے والا جس کو محبت خلاف حق کی طرف لے جائے، دوسرا بغض رکھنے والا حد سے کم

النمط الاوسط فالزموه والزموا السواد الاعظم الخ

کرنے والا جس کو بغض خلاف حق کی طرف لے جائے اور سب سے بہتر حال میرے متعلق درمیانی گروہ کا ہے، جو نہ زیادہ محبت کرے نہ بغض رکھے، پس اس درمیانی حالت کو اپنے لیے ضروری سمجھو اور سواد اعظم یعنی بڑی جماعت کے ساتھ رہو۔

اس کو لکھ کر ابوالائمہ کی تعلیم میں لکھا گیا ہے کہ ''کس قدر صفائی کے ساتھ شیعوں کو ہلاک ہونے والا فرمایا (الی) یہ بھی تصریح کردی کہ جو عقیدہ میرے متعلق سواد اعظم یعنی کلمہ گویان اسلام میں سب سے بڑی جماعت کا ہے اسی کو اختیار کرو۔ (صفحہ۸۱)

شیعہ مصنف اس کو خیانت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ سواد اعظم سے خود حضرت کا گروہ مومنین مراد ہے، نہ کہ ہر زمانہ کی کثرت تعداد (اتحاد صفحہ۸۸)

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر محض خیانت کا دعویٰ کر دینے سے خیانت ثابت ہو جاتی ہے تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ شیعہ مصنف نے سخت خیانت اور بے ایمانی سے کام لے کر عوام کو دھوکا دیا ہے۔ سواد اعظم کی صحیح مراد وہی ہے جو ابوالائمہ کی تعلیم میں بیان کی گئی ہے، بلکہ میں اس دعویٰ پر ایک روشن دلیل بھی رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ سواد اعظم کا یہی حقیقی اور متبادر معنی ہے، پس اس سے بلا قرینہ عدول جائز نہیں ہے، لہٰذا اب شیعہ مصنف کی خیانت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ باقی رہا مصنف اتحاد کا یہ خیال فاسد کہ حضرت علیؓ نے اس خطبہ میں خوارج کو نصیحت فرمائی ہے، اس لیے سواد اعظم سے شیعہ مراد ہوں گے جیسا کہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کے خیال کا فساد اظہر من الشّمس ہے، اس لیے کہ جس طرح خوارج کے مقابلہ میں شیعوں کی جماعت (علی زعم الشیعی) سواد اعظم تھی، اس سے کہیں بڑھ کر اہلسنت کی جماعت سواد اعظم تھی، پس اس خطبہ میں خوارج کے مخاطب ہونے سے خواہ مخواہ یہ سمجھنا اور سمجھانا کہ سواد اعظم سے مراد شیعہ ہیں، فتنہ پرور اتحاد دشمن افراد کی خباثت ہے، شیعوں کو چاہئے کہ ایسے خبثاء سے بچیں۔

ابوالائمہ کی تعلیم میں ایک موقع پر حضرت علیؓ کا یہ خطبہ نقل کیا گیا تھا:

أیھا الناس شقوا أمواج الفتن بسفن النجاۃ وعرجوا عن طریق المنافرۃ

اے لوگو فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں میں بیٹھ کر طے کرو، اور باہم نفرت پیدا کرنے

وضعوا عن تيجان المفاخرة أفلح من نهض بجناح أو استسلم فأراح، ماء آجن أولقمة يغض آكلها ومجتنى الثمرة لغير وقت إيناعها كالزارع بغير أرضه.

کے راستے سے ہٹ جاؤ اور فخر کے تاج اتار رکھو، کامیاب ہوا وہ شخص جس نے قوت بازو کے ساتھ اٹھایا صلح کر لی اور آرام دیا، یہ پانی تلخ ہے اور یہ ایسا لقمہ ہے کہ حلق پکڑتا ہے اور پھل کو پختگی کے وقت سے پہلے توڑنے والا مثل اس شخص کے ہے، جو غیر کی زمین کاشت کرے۔

یہ خطبہ حضرت علیؓ نے اس وقت دیا جب آنحضرت ﷺ کے وفات پاتے ہی حضرت عباسؓ وحضرت ابوسفیانؓ جو تمام مکہ والوں کے سردار تھے حضرت علیؓ سے بیعت خلافت کرنے کو آئے تھے، ابوالائمہ کی تعلیم میں اس خطبہ کو نقل کر کے لکھا گیا ہے کہ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو فتنہ انگیز اور مفسد قرار دیا اور فرمایا کہ تم آپس میں نفرت پیدا کرانا چاہتے ہو اور اپنی خلافت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی میری خلافت کا وقت نہیں آیا، اس وقت میری خلافت کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے پھل کو اس کے پکنے کے وقت سے پہلے توڑنا اور غیر کی زمین میں کھیتی کرنا۔ (ص ۶۳)

اتحاد الفریقین کے مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ اس خطبہ میں بھی خیانت کی گئی ہے، لیکن کوئی خیانت ثابت نہیں کر سکا ہے، بلکہ خود اس نے اس خطبہ میں متعدد خیانتیں کی ہیں: از انجملہ یہ کہ سفن النجاۃ (نجات کی کشتیوں) سے اہلبیت مراد لیتا ہے، حالانکہ یہاں یہ معنی کسی طرح چسپاں نہیں ہوتے، ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ زیدی شیعہ لکھتا ہے:

لا شبهة ان اهل البيت سفن النجاة لكنهم لم يرادوا ههنا بهذه اللفظة لانه لو كان ذاك هو المراد لكان قد امر اباسفيان والعباس بالكون مع اهل البيت ومراده الآن ينقض ذلك لأنه الآن يأمر بالتقية وإظهار اتباع الذين عقد لهم الأمر ويرى ان

بے شبہہ اہل بیت نجات کی کشتی ہیں لیکن یہاں وہ مراد نہیں ہیں اس لیے کہ اگر وہ مراد ہوں تو لازم آئے گا کہ حضرت علیؓ نے ابوسفیانؓ، عباسؓ کو اہل بیت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا، حالانکہ ان کی مراد اس وقت اس کے خلاف ہے تو اس وقت ان کو تقیہ اور انھیں لوگوں کی پیروی کا حکم دے رہے ہیں جن کی بیعت منعقد ہو چکی اور

الاستسلام هو المتعین فالذی ظنه الراوندی لا یحتمله الکلام (ابن ابی الحدید ص ۱۳ ج ۱)	اطاعت کو اس وقت تک متعین جانتے ہیں، پس راوندی نے جو گمان کیا ہے حضرت علیؓ کا کلام اس کا احتمال نہیں رکھتا ہے۔

ازانجملہ یہ کہ **الزارع بغیر أرضه** کا ترجمہ ''غیر مناسب زمین کاشت کرنے والا'' کرتا ہے، حالانکہ ہر معمولی عربی داں جانتا ہے کہ اس کا ترجمہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ ''اپنی زمین کے سوا دوسری زمین میں کاشت کرنے والا'' اس سے آپ شیعہ مصنف کی خیانت یا جہالت کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں۔

ازانجملہ یہ کہ **مجتنی الثمرة بغیر وقت إيناعها** کا یہ مطلب لکھتا ہے کہ ''اب خلافت طلب کرنے اور ان لوگوں سے اس منصب کے نکالنے کا وقت نہیں رہا'' حالانکہ اس کا صاف وصریح مفہوم یہ ہے کہ ابھی ان کی خلافت کا وقت آیا ہی نہیں، چنانچہ ابن ابی الحدید زیدی شیعہ لکھتا ہے:

یرید أنه لیس هذا الوقت هو الوقت الذی یسوغ لی فیه الأمر وانه لم یأن بعد (شرح نہج البلاغۃ ص ۲۷ ج ۱)	حضرت علیؓ کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں میرے لیے خلافت کی طلب جائز ہو اور یہ کہ وہ وقت ابھی آیا ہی نہیں۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ وعباسؓ کی طلب بیعت کو منافرت ومفاخرت سے حضرت علیؓ تعبیر کرتے ہیں۔ شیعہ مصنف خود لکھتا ہے: ''تمھیں چاہئے کہ راہ منافرت سے بچو اور فخر ومباحات کے تاجوں کو اتار دو۔ یعنی اس وقت مجھ سے بیعت کی درخواست کا منشاء بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ منافرت پیدا کرو اور مباہات کرو اس لیے کہ ابھی میری خلافت کا وقت تو آیا نہیں کہ تمہاری درخواست کو صحیح محل پر حمل کیا جائے۔

اتحاد الفریقین میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی نظر میں جو لوگ رسول اللہ کو چھوڑ کر (احد کے) میدان سے بھاگ گئے تھے وہ کافر تھے (صفحہ ۵۵) اور اس کے ثبوت میں روضۃ الاحباب ومدارج النبوۃ وغیرہ کی ایک روایت پیش کی گئی ہے، مگر اس میں کئی طرح کی خیانتیں کی ہیں، ایک یہ کہ روایت میں کئی باتیں اپنی طرف سے ملا دی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جس لفظ پر استدلال کا مدار ہے وہ ابن الاثیر اور روضۃ الاحباب میں موجود نہیں

ہے، پس ان دونوں کتابوں کو حوالہ سراسر فریب اور جھوٹ ہے۔ روضۃ الاحباب میں تو صرف یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تم اپنے بھائیوں سے ملحق نہیں ہوئے؟ تو انھوں نے کہا یا رسول اللہ مجھ کو آپ کے ساتھ اقتدا ہے، اس میں یا ابن الاثیر میں **أأكفر بعد الإيمان** (یعنی کیا میں ایمان کے بعد کافر ہو جاؤں) موجود ہی نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ روایت ہی سرے سے غلط ہے اور شیعہ مصنف نے اس کے لیے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے دو کتابوں میں بصراحت مذکور ہے کہ ذہبی نے اس راوی کو جھوٹا کہا ہے روضۃ الاحباب اور مدارج النبوۃ میں ہے کہ گو اس روایت کو محدثین و اہل سیر نے نقل کیا ہے۔

لیکن ذہبی کہ محک رجال ست در کتاب میزان الاعتدال تضعیف وتکذیب راوی آں نمودہ	لیکن امام ذہبی نے کہ راویوں کی کسوٹی ہیں میزان الاعتدال میں اس کے راوی کو بودا اور جھوٹا کہا ہے

اتحاد الفریقین صفحہ ۵۷ وصفحہ ۵۸ شیعہ مصنف کا خیال ہے کہ خدا نے جنگ احد میں مومن کو منافق سے بالکل ممتاز کر دیا اور وہ امتیاز بقول صاحب معالم یہ تھا کہ جو منافق تھے وہ آنحضرت کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن ایک معمولی عربی داں بھی جانتا ہے کہ شیعہ مصنف کا صاحب معالم پر کھلا ہوا افترا ہے اور جو تفسیر آیت قرآنی کی شیعہ مصنف نے کی ہے وہ صریح تحریف ہے۔ ناظرین معالم کی عبارت کو ایک بار پھر پڑھیں اس میں ایک لفظ **فتخلفوا عن رسول الله** ہے جس کا ترجمہ مصنف اتحاد نے بد دیانتی یا جہالت کی وجہ سے یہ کیا ہے کہ وہ آں حضرت کو چھوڑ کر بھاگ گئے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پیچھے رہ گئے، یعنی آپ کے ساتھ لڑائی میں آئے ہی نہیں، اس اجمال کی تفسیر صاحب خازن نے ص۳۷۲ میں یوں کی ہے کہ جب آنحضرت جنگ احد کے لیے نکلے اور مدینہ واحد کے درمیانی شوط میں پہنچے، تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ایک تہائی لشکر کو لے کر مدینہ کی طرف لوٹ گیا، مذکورۂ بالا آیت قرآنی اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور صاحب معالم نے بھی اسی کو ذکر کیا ہے۔

مصنف اتحاد کو اگر قرآن کریم سے ادنیٰ سا تعلق بھی ہوتا تو قرآن کریم کے الفاظ **مخلفون** **خلفوا، خوالف، يتخلفوا** اور **خالفين** سے معالم کے لفظ **تخلفوا** کے معنی کا سراغ لگا سکتے تھے۔

حاصل کلام یہ کہ مصنف اتحاد کا یہ خیال ایک تو اس لیے غلط ہے کہ معالم کی عبارت کا جو مطلب انھوں نے لکھا ہے وہ غلط ہے، دوسرے یہ خیال اس لیے بھی غلط ہے کہ قرآن پاک میں دو مقام پر اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ جنگ احد میں مشرکین کے حملہ کی تاب نہ لاکر جو مسلمان میدان سے ہٹ گئے تھے ان کی یہ لغزش معاف کردی گئی: **ولقد عفا اللہ عنھم ان اللہ غفور حلیم** یعنی بہ تحقیق یقیناً اللہ نے ان سے درگزر فرمایا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: **ثم صرف عنھم لیبتلیکم ولقد عفا عنکم واللہ ذو فضل علی المؤمنین** یعنی پھر مشرکین سے تمہارا رخ پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائے اور اللہ نے تم سے اس کو معاف کیا اور اللہ مومنین پر بڑے فضل والا ہے۔

اللہ نے صرف اس لغزش کی معافی ہی کا اعلان نہیں فرمایا، بلکہ دوسری آیت میں صاف صاف ان کے ایمان کی بھی شہادت دی اور ان کو مومن قرار دیا، پس اگر مصنف اتحاد کا خیال صحیح ہوتو لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ میدان سے ہٹ جانے والوں کو مومن بھی کہتا ہے اور منافق بھی، ان کی اس لغزش کو معاف بھی کرتا ہے اور اسی لغزش پر ان کو معاذ اللہ منافق سمجھنے کی بھی دعوت دیتا ہے۔ کیا کوئی ادنیٰ مسلم قرآن اور خدا کی نسبت ایسا عقیدہ رکھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

مصنف اتحاد پر ہم کو کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے اس آیت کی ایسی غلط اور تصریحات قرآن کے خلاف تفسیر کیسے کی۔ اس لیے کہ ان کو اور ان کے ہمنواؤں کو قرآن کریم کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سب کو معلوم ہے اور جس کو معلوم نہ ہو وہ اسی ایک مثال سے بہت کچھ معلوم کرسکتا ہے اب میں اس رسالہ کو ختم کرتا ہوں ؎

شکر کہ ایں نامہ بپایان رسید بخیۂ ایں خرقہ بداماں رسید

حبیب الرحمٰن الاعظمی

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۰۱ھ سے ۱۲۰۱ھ تک

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ آپ کی ولادت باسعادت ۴-شوال ۱۱۱۴ھ کو ہوئی، عمر کا پانچواں سال تھا کہ مکتب میں بٹھائے گئے، ساتویں سال ان کے والد بزرگوار نے ان کو نماز میں کھڑا کیا اور روزہ رکھوایا، اسی سال کے آخر میں قرآن پاک ختم کیا، اور فارسی شروع کی، دسویں سال شرح جامی پڑھنا شروع کی اور فی الجملہ مطالعہ کی راہ کھل گئی، اور پندرہویں سال بیضاوی پڑھنے لگے، اسی سال اس عہد کے دستور کے مطابق فنون متعارفہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کی، ان کے پدر بزرگوار نے بڑے پیمانے پر ایک دعوت کا انتظام کر کے عام وخاص کو مدعو کیا، اور اس مجلس میں درس کی اجازت دے کر دعائے برکت کی۔

۲۹ برس کے ہوئے تو حرمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، ۱۱۴۳ھ میں حج کی سعادت حاصل کر کے اگلا سال (۱۱۴۴ھ) بھی اس مقدس سرزمین میں گزارا، طواف وزیارت کے ساتھ ساتھ محدثین سے احادیث کی روایت واجازت اور مشائخ کی صحبت کے برکات وفیوض حاصل کرتے رہے، بعد ازاں مدینہ منورہ کی حاضری کا شرف حاصل کیا، سال کے باقی ایام وہیں گزارے، یہاں مزار فیض بار کی طرف اکثر متوجہ رہے اور بڑا فیض حاصل کیا، اور یہاں بھی محدثین سے روایت واجازت حدیث اور مشائخ طریقت سے فوائد سلوک حاصل کرتے رہے۔

شیخ ابوطاہرؒ کے ہاتھ سے وہ خرقہ پہنا جو تمام خرقہائے صوفیہ کا جامع ہے، علماء حرمین کے ساتھ خوب خوب صحبتیں رہیں۔ اور اسی سال کے آخر میں دوسرا حج کر کے ۱۱۴۵ھ کے آغاز میں وطن کا قصد کیا اور جمعہ ۱۴/رجب ۱۱۴۵ھ کو بخیر وعافیت گھر پہنچے۔

خود شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ آخری بار جب میں شیخ ابوطاہر کردیؒ کی خدمت میں رخصت

ہونے کے لیے حاضر ہوا تو میں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیت کل طریق کنت أعرفه　　إلا طریقاً یودینی لربعکم

شیخ بہت متاثر ہوئے اور بے اختیار رونے لگے

حاجی صفۃ اللہ محدث خیرآبادی آپ نے ۱۱۲۴ھ میں سفر حج کیا تھا، اور تین حج کرکے ہندوستان واپس ہوئے تھے، شیخ محمد طاہر (کذا)[1] مدنی اور عبداللہ بن سالم بصری سے حدیث کی سند حاصل کی تھی، آپ کی وفات ۱۱۵۷ھ میں ہوئی۔　(مآثر الکرام وتاج العروس)

حج سے واپسی کے بعد آپ نے منطق، فلسفہ کا درس دینا بالکلیہ بند کردیا، صرف حدیث وتفسیر کا درس دیتے تھے، ہندوستان میں قطب الدین شمس آبادی یا قطب الدین بن عبدالحلیم سہالوی کے پاس پڑھا تھا۔

شاہ ابوسعید بریلوی آپ نے ملا عبداللہ امیٹھوی کے پاس علم حاصل کرنے کے بعد اپنے چچا شیخ محمد صابر کے ہاتھ پر بیعت کی اور ایک مدت تک اذکار واشغال میں مشغول رہے، پھر شیخ ولی اللہ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جم کر ان کی صحبت میں رہے، جب شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا تو ان کے خلیفہ اکبر شیخ محمد عاشق کی صحبت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کی، اور شاہ محمد عاشق نے ان کو بہت شاندار اجازت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا۔

۱۱۸۷ھ میں اپنے مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ سفر حج کیا، ۲۸؍ ربیع الاول کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے، اور موسم حج کا انتظار کرکے حج کیا، پھر مدینہ حاضر ہوئے، وہاں چھ مہینے قیام کرکے شیخ ابوالحسن سندی صغیر کے پاس مصابیح کی سماعت کی۔ پھر مکہ آکر شیخ محمد میر داد انصاری کے پاس پڑھی۔

واپسی میں مدتوں مدراس میں قیام فرما کر وہاں کے لوگوں کو فیض پہنچایا، جن حضرات نے ان سے کسب فیض کیا، ان میں ان کے استاذ شیخ میر داد انصاری بھی تھے، ۱۱۹۳ھ میں انتقال فرمایا، رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

شاہ محمد عاشق پھلتی شاہ ولی اللہ کے خلیفہ اکبر، اور بقول شیخ ابوطاہر کردی ان کے کمالات کا آئینہ تھے، رشتہ میں شاہ صاحب کے ماموں زاد بھائی تھے، شاہ صاحب کے خلفاء اور تلامذہ میں ان کے پایہ

(۱) مآثر الکرام میں محمد طاہر ہے اور نزہۃ الخواطر میں ابوطاہر محمد۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

کا دوسرا کوئی نہ تھا، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے تکمیل علم ظاہر اور اکتساب فیض باطن انھیں کی خدمت میں کیا۔

شاہ ولی اللہؒ نے ۱۱۴۴ھ میں جب سفر حجاز کیا ہے تو رفاقت میں شاہ محمد عاشقؒ اور ان کے والد شیخ عبید اللہؒ بھی تھے۔ اور صرف سفر اور ادائے مناسک ہی نہیں بلکہ مشائخ حدیث کے پاس سماعت حدیث میں بھی شریک تھے۔

شاہ صاحب کے حالات میں انھوں نے ''القول الجلی'' نام کی ایک کتاب لکھی ہے، جس کا قلمی نسخہ میں نے کاکوری میں دیکھا ہے، شاہ صاحب کی ''دعاء الاعتصام'' کی شرح بھی لکھی ہے، اس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے، ان دونوں کے علاوہ سلوک میں ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ''سبیل الرشاد'' ہے، اور ان سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مصفّیٰ شرح موطا کی تبییض انھیں نے کی ہے۔

شاہ محمد عاشق صاحبؒ کی وفات ۱۱۸۷ھ میں اور شیخ عبید اللہؒ کی ۱۱۴۵ میں ہوئی۔

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادیؒ ۱۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان علم و مشیخت کا گہوارہ تھا، اپنے والد کے چچا شیخ محمد افضل کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے بھائی شیخ محمد طاہر کے پاس کتب درسیہ پڑھیں، اپنے والد سے طریق کی تعلیم پائی، بائیس سال کی عمر میں سجادہ نشیں ہوئے۔

۱۱۴۹ھ میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور شیخ محمد حیات سندیؒ کے پاس صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم کا ایک تہائی حصہ پڑھا اور شیخ نے ان کو اجازت عامہ عطا کی، یہ شعبان ۱۱۵۰ھ کا واقعہ ہے، اس کے بعد ہندوستان واپس ہوئے اور چند برسوں کے بعد ۱۱۵۴ میں دوبارہ کشتی کی سواری سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر مرہٹوں نے کشتی پر چھاپا مارا اور ان کا ساز و سامان لوٹ لیا، اس کے بعد ان کو بندر سورت پر چھوڑ دیا، یہ دوسری کشتی کے انتظار میں وہاں پڑے رہے، ۱۱۵۶ میں دوسری کشتی ملی، اس سے ''مخا'' تک آئے اور وہاں اتر کر کچھ دن رہے، پھر مکہ گئے اور حج کیا۔

۱۱۵۹ھ میں ہندوستان واپس آکر ایک سال قیام کیا، سال بھر کے بعد سہ بارہ حج کے ارادہ سے نکلے اور ہوگلی میں کشتی پر سوار ہوئے، مگر راستہ میں کشتی شکستہ ہوگئی، مجبوراً چاٹگام آکر دوسری کشتی کا انتظار کر کے جب مایوس ہو گئے تو الہ آباد لوٹ آئے۔

کچھ زمانہ کے بعد پھر اس ارادہ سے نکلے مگر برہان پور پہنچ کر سرسام ہو گیا اور اس بیماری سے

جانبر نہ ہوسکے، ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو برہان پور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے، میر غلام علی آزاد سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، انھوں نے سروآزاد میں ان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ محمد فاخرؒ علم وعمل اور تقویٰ وتواضع میں یکتائے روزگار تھے۔

شیخ محمد عابد سنامیؒ علم ومعرفت شیخ عبدالاحد بن محمد سعید سرہندی کی خدمت میں حاصل کیا اور مدت دراز تک ان کی صحبت میں رہے، لاہور سے پیادہ پا سفر کر کے حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔

بڑے عبادت گزار تھے، تہجد کی نماز میں ساٹھ بار سورۂ یٰسین پڑھتے تھے، اور ہر دو رکعت پر مراقبہ کرتے تھے، روزانہ بیس ہزار بار کلمہ طیبہ، ایک ہزار بار درود شریف پڑھتے، اور ایک ہزار بار ذکر نفی واثبات کرتے تھے، تلاوت کلام پاک بھی بڑی مقدار میں کرتے تھے، ان کے مدرسہ میں دو سو مرید اور طالب علم رہتے تھے۔

حضرت میرزا مظہر جان جاناں نے آپ سے کسب فیض کیا ہے، آپ کی وفات ۱۱۶۰ھ میں ہوئی۔

شیخ نورالدین گجراتیؒ نہایت زبردست عالم تھے، انھوں نے سات دن میں اپنی ماں کے پاس پوری گلستاں پڑھ ڈالی تھی، احمد آباد میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم اس وقت نہیں تھا، اکرم الدین گجراتی نے احمد آباد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے صرفہ سے ان کے لیے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اور وظائف طلبہ کے لیے کئی گاؤں وقف کیے تھے۔

مولانا نورالدینؒ بڑے عابد وزاہد بھی تھے، رات میں دوبار اٹھ کر نفلیں پڑھتے تھے، اور جب جب لیٹتے تھے تو ایک ہزار بار کلمۂ شہادت اور ایک ہزار بار درود شریف کا وِرد کرتے تھے، ملوک وسلاطین کا ہدیہ وروزینہ قبول نہیں کرتے تھے۔

۱۱۴۱ھ میں جب کہ ان کی عمر ۹۱ سال سے زائد تھی حج وزیارت کا شرف حاصل کیا، ان کی تصنیفات بہت ہیں، از انجملہ ایک نورالقاری شرح صحیح بخاری بھی ہے، ۱۱۵۵ھ میں انتقال کیا، احمد آباد میں اپنے مدرسہ کے قریب ہی مدفون ہیں۔

شیخ ابوالحسن سندی کبیرؒ ٹھٹھ (سند) میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی، پھر تستر پہنچ کر تحصیل علم

کی، اس کے بعد مدینہ منورہ جا کر وہیں مقیم ہوگئے، وہاں سید محمد برزنجی وشیخ ابراہیم کورانی وغیرہ کے پاس علم حاصل کیا، فراغت کے بعد مسجد نبوی میں درس دیا، صحاح ستہ اور مسند احمد پر حاشیہ لکھا، ان میں سے بعض حواشی طبع بھی ہوگئے ہیں، ۱۱۳۶ھ یا ۱۱۳۸ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو اہل مدینہ کو بڑا غم ہوا، بازار بند ہوگیا اور حکام تک نے مسجد نبوی تک ان کے جنازہ کو کاندھا دیا، جنازہ میں بڑا مجمع تھا، عورتیں بھی شریک تھیں، بہتوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

ان کے بعد ایک دوسرے ابوالحسن سندیؒ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے، شیخ محمد حیات سندیؒ سے انھوں نے حدیث کا علم حاصل کیا اور مدتوں ان کے پاس رہے، پھر مدینہ میں درس دیا، کثرت درس وافادہ میں اس وقت ان کی مثال وہاں نہیں تھی، وہ بھی صاحب تصنیفات ہیں جن میں ایک جامع الاصول کی شرح بھی ہے، ان کو ابوالحسن سندی صغیر کہتے ہیں، ان کی وفات ۱۱۸۷ھ میں ہوئی۔

سید احمد شہید بریلویؒ | ولادت باسعادت ۱۲۰۱ھ میں ہوئی، سن شعور ہی سے صلاح وتقویٰ سے آراستہ اور خدمتِ خلق کے جذبہ سے معمور تھے، بیواؤں اور یتیموں کے گھر جا جا کر ان کا کام کاج کرتے تھے، پانی بھر دیتے تھے، لکڑیاں چُن کر لادیتے، بازار سے سودا خرید کر پہنچاتے تھے۔

تحصیل علوم متعارفہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی، ابتداء میں کچھ دن فوج میں رہے، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوکر سلوک کے منازل طے کیے، اور علم لدنی ومعرفت حق میں تمام ہمسروں سے فائق ہوگئے۔

۱۲۳۷ھ میں حجاز کا سفر کیا، اس سفر میں آپ کے ساتھ سات سوستاون آدمی تھے، دلمئو میں کشتی پر سوار ہوئے اور پاس میں جو کچھ تھا سب مساکین پر تقسیم کردیا، اور یہ کہہ کر کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں چل پڑے، الہ آباد، بنارس، غازی پور، پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے، راستہ میں ہر جگہ اتر کر تلقین وارشاد بھی فرماتے رہے، کلکتہ سے دوسری کشتیوں میں سوار ہوکر حجاز پہنچے، اثنائے سفر میں اور اس کے بعد حرمین میں بکثرت لوگوں نے آپ سے فیض پایا، حرمین میں ایک سال قیام کرنے کے بعد ۱۲۳۹ھ میں ہندوستان واپس آئے۔

۱۲۴۱ھ میں علم جہاد بلند کیا، مگر اپنوں ہی کی غداری کی وجہ سے ۱۲۴۶ھ میں جام شہادت نوش کیا، سید شہید کے حالات میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً صراط مستقیم (مولانا اسماعیل شہید)

جس کا ترجمہ عربی میں مولانا عبدالحی بڈھانوی نے کیا ہے، اور منظورۃ السعداء ومخزن احمدی ووقائع احمدیہ وغیرہ، اردو میں سیرت سید احمد شہید قابل دید ہے، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی بھی سفر حج میں سید صاحب کے رفیق تھے، اور انھیں کے ساتھ معرکۂ بالاکوٹ میں شہید بھی ہوئے، نیز مولانا عبدالحی بڈھانوی بھی رفیق سفر حج تھے، قاضی شوکانی نے اپنی بعض تصنیفات اور اپنی مرویات کی اجازت عامہ آپ کے پاس بھیجی تھی، جہاد میں بھی آپ سید صاحب کے ہمرکاب تھے۔

آپ کی وفات ۱۲۴۳ھ میں سید صاحب سے تقریباً تین سال پہلے اسی سفر جہاد میں بیماری سے ہوئی، سرحد میں ایک گاؤں ''خار'' نامی ہے وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا ولی اللہ سورتیؒ آپ مولانا غلام محمدؒ کے صاحبزادہ تھے، اور مولانا غلام ملا نظام الدینؒ کے شاگرد رشید تھے، مدتوں ان کے پاس رہے، جب انور خاں گوپاموی برہانپور کے والی مقرر ہوئے تو ان کی معیت میں برہانپور آئے، انور خاں نے ان کے لیے ایک نہایت شاندار مدرسہ تعمیر کرا کر مدرسہ کے لیے چھتیس ہزار روپیہ سالانہ مقرر کردی، مولانا غلام محمدؒ نے ایک مدت تک اس مدرسہ میں درس دیا، اپنے لڑکے ولی اللہ کو احمد آباد سے بلا کر سات سال میں تمام کتب درسیہ کی تعلیم دی۔

آصف جاہ کا جب برہان پور پر تسلط ہوا تو مدرسہ کا وظیفہ بند کردیا، اس لیے کہ مولانا غلام محمدؒ اس سے ملنے نہیں گئے تھے، اس کے بعد مولانا غلام محمدؒ نے اپنے لڑکے ولی اللہ کو حجاز روانہ کردیا۔

حاجی رفیع الدین مرادآبادیؒ نے لکھا ہے کہ مولانا غلام محمد تجوید وقرأت میں یکتائے روزگار اور علوم وفنون میں بحر ذخار تھے، قلوب میں ان کی بڑی عظمت تھی اور ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، بایں ہمہ انھوں نے کپڑا بننے کا قدیم پیشہ ترک نہیں کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۱۴۹ھ میں ہوئی۔

مولانا ولی اللہ نے حجاز پہنچ کر حج وزیارت کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شیخ ابوالحسن سندیؒ سے حدیث کا فن بھی حاصل کیا، جب ہندوستان واپس ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، یہ نزہۃ الخواطر کا بیان ہے، اور حاجی رفیع الدینؒ کا بیان یہ ہے کہ مولانا ولی اللہ اپنے والد ماجد کے ساتھ دو مرتبہ سفر حرمین میں گئے۔ اب سورت میں قناعت کی زندگی بسر کر رہے اور استقامت وتوکل کے ساتھ موصوف ہیں۔ (سفرنامہ حرمین)

حاجی رفیع الدین کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور اچھی خاصی صحبت رہی ہے، سفرنامہ میں

ان سے سنی ہوئی بہت سی مفید اور تحقیقی باتیں انھوں نے نقل کی ہیں۔

مولانا ولی اللہ صاحب تصنیف بھی تھے، ان کی ایک کتاب کا نام "**التنبیھات النبویة فی سلوک الطریقة المصطفویة**" ہے۔ آپ کا سال وفات ۱۲۰۷ھ ہے۔

مولانا محمد صالح بن خیر الدین سورتیؒ مولانا خیر الدینؒ سورت کے محدث تھے، شیخ محمد حیات سندیؒ سے مدینہ منورہ میں سند حدیث حاصل کی، پچاس برس تک حدیث کا درس دیا تھا، ۱۲۰۶ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا محمد صالح ان کے صاحبزادہ اور شاگرد رشید تھے، جس سال حاجی رفیع الدین مرادآبادی بارادۂ حج وارد سورت ہوئے تھے، اسی سال انھوں نے ایک کشتی تیار کرائی تھی جس کا نام "سفینۃ الرسول"[1] رکھا تھا۔

شیخ خیر الدین کی فرط شفقت اور مولانا محمد صالح کی محبت والفت کی بنا پر حاجی رفیع الدین بھی اسی کشتی پر سوار ہو کر حجاز گئے، اور اسی پر واپسی بھی ہوئی، حاجی صاحب کا بیان ہے کہ صاحبزادہ کے اخلاص کا مظاہرہ ہر روز زیادہ ہی ہوتا رہا، مولانا محمد صالح سورت کے قاضی مقرر ہوئے، اور تازندگی اسی منصب پر رہے، ۱۲۳۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

حاجی رفیع الدین مرادآبادیؒ نواب خاندان کے تھے، رئیسوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے مگر مزاج فقیرانہ تھا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خدمت میں مدتوں رہ کر علم و فیض حاصل کیا، حج کو جاتے ہوئے سورت میں شیخ خیر الدین محدثؒ سے حدیث کی سند لی، حرمین شریفین کے علماء سے بھی مستفید ہوئے۔

محرم ۱۲۰۱ھ میں حج کے لیے نکلے، اور تقریباً دو ماہ میں سورت پہنچے، ۹؍جمادی الثانیہ کو سفینۃ الرسول نامی کشتی میں سوار ہوئے، اس میں ۲۱۶ آدمی سوار تھے، ۲۳؍رجب کو عدن نمودار ہوا، ۲۴؍رجب کو باب المندب پہنچے، ۲۶؍رجب کو مخا کی سیر کی، مخا سے ۲۹؍رجب کو روانہ ہوئے، ۲۱؍شعبان کو حدیدہ پہنچے، ۲۸؍شعبان کو کامران آئے، ۸؍رمضان کو بندرگاہ جازان کے مقابل، اور ۲۸؍رمضان کو قنفدہ پہنچے۔

(۱) نزہۃ الخواطر میں ہے کہ یہ کشتی مولانا ولی اللہ بن مولانا غلام محمد کی تھی، اور مولانا رفیع الدین، مولانا ولی اللہ ہی کے ہمسفر تھے، ہم نے جو لکھا ہے وہ خود مولانا رفیع الدین کا بیان ہے۔

چونکہ کشتی کو یہیں سے ہندوستان واپس جانا تھا، اس لیے ایک سو دس دن کشتی میں رہنے کے بعد یہیں اتر پڑے۔ ۵؍شوال کو اونٹ پر مکہ روانہ ہوئے، ۱۲؍کو سعدیہ پہنچے اور وہیں احرام باندھا، ۱۴؍کو مکہ معظّمہ میں حاضری ہوئی، مکہ قریب آیا تو سواری سے اتر پڑے، اور چار کوس سے زیادہ ننگے پاؤں، ننگے سر پیدل چل کر مکہ پہنچے۔

فرماتے ہیں کہ پیدل چلنے میں دھوپ کی تیزی اور راستے کی کنکریوں اور ریت کی وجہ سے مشقت تو بہت زیادہ اٹھائی، مگر جمال کعبہ کے دیدار سے تمام عمر کی کلفتیں دور ہو گئیں۔

جمال کعبہ مگر عذرر ہرواں خواہد　　　　که جان زنده دلاں سوخت در بیابانش

مکہ پہنچ کر چار مہینے قیام کیا، ۱۸؍صفر ۱۲۰۲ھ کو طواف وداع کر کے مدینہ منورہ کے ارادہ سے جدہ کو روانہ ہوئے اور ۶؍ربیع الاول کو مدینہ منورہ پہنچے، اور وہاں چار مہینے بیس دن رہ کر ۲۸؍رجب ۱۲۰۲ھ کو مکہ کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں بدر کی زیارت کی، ۱۳؍شعبان کو مکہ معظّمہ پہنچے، ۲۸؍شعبان کو طائف گئے، واپسی میں قرن سے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ ادا کیا، رمضان کا مہینہ مکہ میں گزارا، عید کی نماز شریف غالب کی اقتداء میں ادا کی، ۲۸؍شوال کو مکہ سے کوچ کیا، اور ۵؍ذی قعدہ کو بعد عشاء سفینۃ الرسول میں سوار ہو کر ہندوستان روانہ ہوئے، اور ٹھیک عید اضحیٰ کے دن بمبئی کے ساحل پر پہنچے، اس کے بعد مختلف مقامات میں رکتے رکاتے یکم ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ کو مراد آباد پہنچے، اس سفر کی پوری مدت ۲ سال، ۲ ماہ اور دو ہفتہ تھی۔

حاجی رفیع الدینؒ بہت جید عالم تھے، ان کی تصنیفات میں سے قصر الآمال بذکر الحال والمآل، سلوالکئیب بذکر الحبیب، افادات عزیزیہ اور سفر نامہ حرمین کا مطالعہ میں نے کیا ہے، ان میں سے کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی ہے، سفر نامہ کے نسخے رام پور اور حیدر آباد وغیرہ میں، میں نے دیکھے ہیں، کہیں اس کا نام حالات الحرمین درج ہے، اور کہیں مسیر الحرمین۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے اس سفر نامہ کو اردو میں منتقل کر کے ماہنامہ الفرقان [1] میں شائع کرا دیا ہے، فریدی صاحب نے اس کو ہندوستان کا سب سے پہلا سفر نامہ قرار دیا ہے، لیکن بظاہر حاجی امین الدین کاکوروی کا سفر نامہ اس سے قدیم ہے، اس لیے کہ انھوں نے ۱۱۸۷ھ میں حج کیا ہے اور سفر نامے عموماً اسی سفر میں یا واپسی کے

(۱) دیکھو الفرقان بابت شوال و ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ (جلد ۲۸)

بعد جلد ہی لکھے جاتے ہیں۔

مفتی ولی اللہؒ فرخ آبادی | ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے، قنوج میں مولانا عبدالباسط قنوجی کے پاس تمام کتب درسیہ پڑھیں، ۱۱۸۹ھ میں حج وزیارت کی سعادت حاصل کی اور شیخ احمد بن محمد سعید صقر اور ان کے والد کے پاس نیز عبدالملک حنفی مفتی مکہ اور شیخ ابراہیم شافعی کے پاس قرأت وحدیث کی تحصیل کی۔

۱۱۹۶ھ میں ہندوستان واپس آئے اور فرخ آباد میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا، اس کا نام فخر المرابع رکھا تھا، کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ان میں سے ایک قرآن پاک کی تفسیر تین جلدوں میں ہے، اس کا نام نظم الجواہر ونضد الدرر ہے، تفسیر کی زبان فارسی ہے، دوسری صحیح مسلم کی شرح ہے جس کا نام المطر الثجاج ہے، تفسیر میری نظر سے گزری ہے، ۱۲۴۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

مسند الدیار الہندیہ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ دہلوی | آپ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے نواسہ تھے، ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے، اپنے نانا کے یہاں پرورش پائی، کافیہ تک مولانا عبدالحئیؒ بڑھانوی سے اور باقی کتب درسیہ شاہ عبدالقادر کے پاس پڑھیں، انھیں کی خدمت میں فقہ وحدیث میں بھی مہارت حاصل کی، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے سلسلہ سند استوار کیا، شاہ صاحب نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا، اور اپنی ساری کتابیں نیز مکانات ان کو ہبہ کر دیے۔

شاہ محمد اسحاقؒ نے ایک دفعہ ۱۲۴۰ھ میں حج وزیارت کا شرف حاصل کیا، اسی سفر میں شیخ عمر ابن عبدالکریم مکیؒ سے حدیث کی سند لی، اس کے بعد ہندوستان آ کر سولہ سال تک دہلی میں درس دیا۔ ۱۲۵۸ھ میں اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد یعقوبؒ اور تمام اہل وعیال کے ساتھ دوبارہ حجاز گئے اور حج وزیارت کے بعد مکہ میں مقیم ہوگئے، مکہ میں آپ سے شریف محمد بن ناصر حازمی نے استفادہ کیا، ہندوستان کے اکابر اہل علم نے آپ سے حدیث کا درس لیا، دیوبند وسہارنپور اور ہندوستان کے اکثر مدارس کے علماء ومدرسین کا سلسلہ سند آپ ہی سے ملتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ دہلوی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، نواب قطب الدینؒ دہلوی، مولانا احمد علیؒ سہارنپوری، مولانا عبدالقیومؒ بھوپالی اور مفتی عنایت احمدؒ کاکوروی آپ کے جلیل القدر تلامذہ میں ہیں، پورہ معروف کے مولانا محمد طاہرؒ نے بھی حدیث کی سند آپ سے مکہ میں لی تھی۔

شیخ عبداللہ سراج مکیؒ شاہ صاحب کی وفات کے بعد غسل دینے کے وقت فرماتے تھے کہ اگر یہ زندہ رہتے اور میں عمر بھر ان کے پاس حدیث پڑھتا جب بھی ان کے مرتبہ کو نہ پہنچتا۔ اور شیخ عمر بن عبدالکریمؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان میں ان کے نانا کی برکت حلول کر گئی ہے۔

شاہ اسحاقؒ صاحب نے مکہ میں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، شاہ محمد یعقوبؒ نے شرح جامی کے تین سبق شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھے، شاہ صاحب نے ٹہلتے ہوئے ان کو جلالین بھی پڑھادی تھی، باقی کتب درسیہ شاہ رفیع الدینؒ کے پاس پڑھیں۔ حدیث کی سند شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے عنایت کی، آپ کا انتقال بھی مکہ میں ہوا۔ سالِ وفات ۱۲۸۲ھ ہے۔ نواب صدیق حسن نے مکہ خط لکھ کر آپ سے حدیث کی سند حاصل کی ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ ۱۲۳۵ھ میں ولادت ہوئی، مولانا حبیب اللہ دہلوی کے پاس قرآن پاک یاد کیا اور نحو و عربیت کی تعلیم پائی، فقہ و حدیث پر خاص توجہ کی، حضرت شاہ اسحاق دہلوی سے حدیث کا درس لیا، اپنے والد سے موطا امام محمد اور مولانا مخصوص اللہ سے مشکوٰۃ پڑھی۔

۱۲۴۹ھ میں جب آپ کی عمر ۱۴ سال کی تھی اپنے والد شاہ ابوسعید مجددی کے ساتھ حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور شیخ عابد سندی و شیخ اسماعیل رومی سے حدیث کی سند حاصل کی، حج کے بعد حضرت شاہ ابوسعید بیمار ہوگئے، زیارت حرمین کے بعد ہندوستان کی طرف کوچ کیا، ۲۲/رمضان ۱۲۵۰ھ کو ٹونک پہنچے اور عید کے دن داعی اجل کو لبیک کہا، نعش مبارک دہلی لائی گئی، چالیس دن کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی غسل دیا گیا ہے۔

شاہ عبدالغنی رحمہ اللہ والد کے انتقال کے بعد چند مہینے ٹونک میں مقیم رہے، پھر دہلی آکر برسوں درس دیا اور مریدوں کی تربیت فرمائی، شاہ ابوسعید صاحب نے انتقال کے دن آپ کو اجازت مرحمت فرمائی اور چند وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ دنیا داروں کے دروازہ پر جاؤ گے تو ذلت اٹھاؤ گے، ورنہ وہ خود تمھارے دروازہ پر آکر ناک رگڑیں گے، محمد حسین مرادآبادی نے لکھا ہے کہ میں چند روز خانقاہ میں شاہ عبدالغنی صاحب کی خدمت میں رہا ہوں، میں نے ان کو تعلیم علم ظاہر و باطن میں مشغول پایا، فجر کے بعد مراقبہ کرتے تھے، اشراق کے بعد مریدوں کو توجہ دیتے تھے، پھر حدیث کا درس دیتے تھے، قیلولہ و نماز ظہر کے بعد فقہ کا درس دیتے تھے، نماز عصر کے بعد تعلیم باطن و القاء نسبت فرماتے

تھے، دنیا واہل دنیا کی باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں کے نوکروں اور ملازموں کا ہدیہ اور دعوت قبول نہیں کرتے تھے، غایت احتیاط کی بنا پر بازار کے آم نہیں کھاتے تھے، فرماتے تھے کہ بیچنے والوں نے مالکوں سے بیع فاسد کے ذریعہ خریدا ہے۔

۱۲۰۳ھ (نزہۃ الخواطر) یا ۱۲۰۴ھ (انوار العارفین) میں آشوب دہلی (جو غدر کے نام سے مشہور ہے) کے وقت اپنے اہل وعیال کو لے کر حجاز کی طرف ہجرت فرمائی، شریف نے مسجد نبوی کے سامنے آپ کے رہنے کے لیے ایک حجرہ عنایت کیا، اسی میں آپ مقیم ہوئے، اور جب تک زندہ رہے مسجد نبوی میں بقول مراد آبادی سرکار کے سامنے تعلیم علم ظاہر وباطن فرماتے رہے۔

ہندوستان میں حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی، اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ آپ کے حلقۂ درس حدیث میں شریک ہوئے اور سند واجازت سے مشرف ہوئے۔

اور حجاز میں مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی اور مولانا عبداللہؒ مئوی نے آپ سے سند حدیث حاصل کی۔ ابن ماجہ پر شاہ صاحب کا حاشیہ انجاح الحاجہ ان کی یادگار ہے، اردو میں بھی ایک رسالہ آپ کا میں نے دیکھا ہے۔

آپ کی وفات ۱۲۹۶ھ میں ہوئی۔

(جاری ہے)

معذرت

جلد نمبر ۲۳ شمارہ نمبر ۲ میں ''یزید بن معاویہ'' پر جو ضمیمہ شائع ہوا ہے، اس میں غلطی سے حمد محمد العریبنان کی تحریر لکھ دیا گیا ہے، ضمیمہ ان کا نہیں ہے بلکہ محمد بن ابراہیم الشیبانی کا ہے، اس سے پہلے کی جو قسطیں خانہ کعبہ کی آتشزدگی سے متعلق تھیں، وہ صرف حمد محمد العریبنان کی تھیں، آخری قسط شائع کرتے وقت غلطی سے اس پر تنبہ نہیں ہوسکا۔

ضرورتِ تدوین فقہ

مولانا ہلال احمد مالیگاؤں

اسلام میں احکام ومسائل کی بنیادی طور پر دوقسمیں ہیں۔

(۱) **منصوص:** وہ احکام ومسائل جو آیاتِ قرآنیہ اور احادیث سے صراحتاً ثابت ہیں۔(یعنی صریح آیات یا احادیثِ صریحہ سے ثابت ہیں)

(۲) **غیر منصوص:** غیر منصوص کی دوقسمیں ہیں: (الف) وہ احکام ومسائل جن میں آیاتِ قرآنیہ یا احادیث تو موجود ہیں، لیکن ان میں کسی قدر ابہام یا اجمال ہے یا بظاہر متعارض ہیں۔ (ب) بےشمار احکام ومسائل ایسے ہیں جن کے دلائل بظاہر قرآن یا احادیث میں صراحتاً موجود نہیں ہیں۔

ان دونوں (الف اور ب) قسموں کے احکام ومسائل غیر منصوصہ ہیں، جن میں قیاس (اجتھاد یا استنباط) سے کام لینا ہوتا ہے۔ایسے موقع پر عمل کرنے والے کیلئے یہ الجھن اور دشواری پیدا ہوتی ہے کہ وہ کس طرح عمل کرے اور کون سا راستہ اختیار کرے۔اس الجھن کو دور کرنے کی دوصورتیں ہیں:

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی فہم وبصیرت پر اعتماد کرکے اس کا خود ہی کوئی فیصلہ کرلے اور اس پر عمل پیرا ہوجائے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اِن احکام ومسائل میں خود کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے یہ دیکھے کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف (صحابہ، تابعین، تبع تابعین) نے ان پر کیسے عمل کیا ہے اور اس سلسلہ میں کون سا راستہ اختیار کیا ہے۔ایسی الجھن کے موقع پر عمدہ بات یہی ہے کہ جس طرح ہم اپنے دنیاوی معاملات میں ماہرینِ فن کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں، مثلاً بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، کورٹ میں کوئی مقدمہ ہو تو وکیل کرتے ہیں، مکان بنوانا ہوتا ہے تو انجینئر کی خدمات حاصل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور جو وہ کہتے ہیں اسکے سامنے سرِتسلیم خم کردیتے ہیں، اس سے حجت بازی نہیں کرتے، اسی طرح دینی معاملات میں ان مقدس ترین حضرات کی فہم وبصیرت پر اعتماد کرتے ہوئے ان ائمہ مجتہدین یا ان کے مدون فقہ کی طرف رجوع ضروری ہے۔

اگر ائمہ فن کی اقتداء کی بجائے اپنی فہم ناقص پر اعتماد کر کے خود سے قیاس یا اجتہاد یا استنباط کرے تو اپنی خواہش سے دل لگتی چیز پر عمل کرے گا۔ایسی صورت میں خواہشِ نفسانی کی اتباع ہوگی نہ کہ شریعت کی [حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں: اوراس میں (مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے میں) بہت سی مصلحتیں ہیں خاص کراس زمانے میں جب کہ ہمتیں بہت پست ہوگئی ہیں اور نفوس میں خواہشاتِ نفسانی سرایت کرگئی ہیں اور ہر رائے والا اپنی رائے پر ناز کرنے لگا ہے (حجۃ اللہ البالغہ مترجم ج اص ۳۶۱)]۔اور انسان کو گمراہ کرنے کیلئے شیطان کا یہ کامیاب حربہ ہے کہ انسان خواہشاتِ نفسانی کا بندہ ہوجائے اور اس پر عمل کرنے لگے۔اس کے ذریعہ شیطان انسان کے قلب پر قابو پالیتا ہے اور بدنِ انسانی میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے زہر۔ اور یہ انسان کے دین کیلئے بہت ہی خطرناک ہے۔خواہشاتِ نفسانی پر چلنے والوں کیلئے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بہت ہی مذمت فرمائی ہے۔ایک جگہ اسے ''کتے'' سے تشبیہ دی ہے ارشاد ہے **'وَ لٰکِنّہٗ اَخْلَدَ اِلی الارض و اتّبَعَ ھَواہُ فمثلہ کمثل الکلب'** ترجمہ: یعنی وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا سو اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی (سورۂ اعراف پ۹) اور ایک جگہ حضور ﷺ کو خطاب فرما کر پوری امت کو یہ پیغام سنایا کہ خواہشات نفسانی کی پیروی سے بچتے رہنا ورنہ وہ اللہ کے راستے سے ہٹادے گی ارشاد ہے **''وَ لا تتبع الھویٰ فیضلّک عن سبیل اللّٰہ''** (سورہ ص پ۲۳)۔ایک حدیث میں ارشاد ہے **''و اِنَّہٗ سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بِھم تلک الاھواء کما یتجاری الکلب لصاحبہِ لا یبقی منہ عرق و لا مفصل اِلّا دخلہ''** یعنی میری امت میں آئندہ کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن میں ہوا اور خواہشات اسطرح رچی بسی ہوئی ہوں گی جیسا کہ ہڑکا ہوا کتا (باولا کتا) کسی کو کاٹ لے۔اس شخص کے جسم میں کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا باقی نہیں رہتا کہ جس میں کتے کے کاٹنے کی وجہ سے زہر پیوست نہ ہوگیا ہو (بحوالہ مشکوۃ ص ۳۰)۔اس حدیث میں اگر غور کیا جائے تو دو باتیں معلوم ہوں گی: ایک یہ کہ کتا جس کو کاٹ لے اسکے جسم کے رگ و پے میں زہر پیوست ہو جاتا ہے جو اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، اور دوسری بات یہ کہ یہ مریض اگر تندرست انسان کو کاٹ کھائے تو اس کی بھی یہی حالت ہوجاتی ہے۔نفسانی خواہشات پر چلنے والے کا بھی یہی حال ہے کہ پہلے خود اس کا ایمان معرض خطر میں آجاتا ہے اور جو شخص اس کی صحبت کو اختیار کرتا ہے اس کا بھی دینی نقصان ہوتا ہے۔

دین کے غیر منصوص مسائل کے اجتہاد کے لئے بہت سے مجتہدین ہوئے ہیں، جن کے

اجتھاد پر امت کا عمل رہا ہے، لیکن دوسری صدی کے بعد لوگوں میں متعین مجتھد کی پیروی کا رواج ہوا، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں ''اور دوسری صدی کے بعد لوگوں میں متعین مجتہد کی پیروی کا رواج ہوا اور بہت کم ایسے لوگ تھے جو کسی خاص مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ رکھتے ہوں اور یہی طریقہ اس وقت رائج تھا (انصاف مع ترجمہ کشاف ص ۹)۔ اس کے بعد ائمہ اربعہ کے مدون فقہ پر امت کا اجماع ہو گیا''۔ شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں ''اور یہ مذاہب اربعہ جو مدون و مرتب ہو گئے ہیں پوری امت نے یا امت کے معتمد حضرات نے ان مذاہبِ اربعہ (مشہورہ) کی تقلید کے جواز پر اجماع کر لیا ہے (اور یہ اجماع) آج تک باقی ہے (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۳۶۱)''۔

معلوم ہوا کہ ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) نے تدوین فقہ کر کے امت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا اور انھیں مسالک اربعہ پر امت کا اجماع ہو گیا۔ اب اجماع کے بعد اس سے خروج گمراہی کا سبب ہے، بلکہ مشہور محدث و مُفسر قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تحریر فرماتے ہیں ''تیسری یا چوتھی صدی کے بعد فروعی مسائل میں اہل سنت والجماعت کے چار مذہب رہ گئے، کوئی پانچواں مذہب باقی نہیں رہا، گویا اس امر پر اجماع ہو گیا کہ جو قول ان چاروں کے خلاف ہو وہ باطل ہے اور خدا تعالیٰ کا فرمان ہے ''جو شخص مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہو گا تو ہم اس کو جو کچھ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۶۴)۔

نجات اہلِ سنت والجماعت کے راستے پر ہے اور فی زمانہ اہل سنت والجماعت مسالک اربعہ پر مشتمل ہے، جو ائمہ اربعہ اور ان کے اصحاب کے ذریعہ مدّون کئے گئے ہیں، یعنی مسالکِ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''سوادِ اعظم کی اتباع کرو'' اور چونکہ مذاہبِ حقّہ سوائے ان چار مذہبوں کے باقی نہ رہے اس لئے ان کی اتباع کرنا سوادِ اعظم کی اتباع کرنا اور اس سے باہر نکلنا سوادِ اعظم سے باہر نکلنا ہے (عقد الجید ص ۳۱)۔

فقہ حنفی شورائی ہے

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایمان والوں کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے ''وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ. ترجمہ: ان کے کام آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہیں''۔ خلیفہ راشد ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ کی سنّت بھی یہی تھی کہ جب کوئی ایسا مسئلہ پیش آتا کہ ان کے نزدیک اسمیں اللہ تعالیٰ اور

رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات موجود نہیں ہوتی (یعنی اس مسئلہ میں صریح آیت یا صریح حدیث نہ ہوتی) تو حضرت عمر بن الخطابؓ رسول اللہ ﷺ کے اصحابؓ کو جمع کرتے پھر ان کے درمیان شوریٰ ہوتی۔
اسی طرح اِمام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا عمل بھی تھا کہ ان کے نزدیک اجتہادی امور میں شوریٰ ہوتی۔ جب کوئی اجتہادی امر پیش آتا تو چالیس ائمہ مجتہدین کی مجلس میں اس پر بحث ہوتی۔ بعض مرتبہ یہ بحث ایک مہینہ یا اس سے زائد بھی ہوتی۔ جب یہ مجتہدین کسی ایک امر پر متفق ہو جاتے تو اس کے اثبات کا اور اس کے لکھنے کا حکم دیا جاتا۔ اگر کسی اُمر پر متفقہ فیصلہ نہ ہوتا تو مختلف فیہ اقوال بھی لکھے جاتے۔ ان تمام امور کے مجموعے کو ''ظاهر الرّواية'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ تمام ظاهر الرّواية حضرت امام محمدؒ کی کتابیں ''مبسوط (جس کا دوسرا نام اصل بھی ہے)''، ''زیادات''، ''جامع الصغیر''، ''جامع الکبیر''، السّیر الصغیر، السّیر الکبیر'' میں موجود ہیں جو فتویٰ نویسی میں راجح روایات قرار دی گئی ہیں۔ ان کتابوں کو ظاہر روایۃ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ مصنف سے بروایت متواتر ومشہور ثابت ہوئی ہیں، قلوب پر ان کتابوں کا اعتماد قائم ہے، اور ان کے مسائل کو عام طور پر علمائے حنفیہ نے تسلیم کیا ہے۔ فقہ حنفی کے مسائل میں اسے پہلا طبقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسرا طبقہ ''نوادرات'' کا ہے، یہ وہ مسائل ہیں جو ائمہ ثلاثہ حنفیہ سے مروی تو ہیں مگر امام محمد کی مذکورہ بالا چھ کتابوں میں نہیں ہیں۔ تیسرا طبقہ ''نوازل و واقعات'' کا ہے، یہ وہ مسائل ہیں جن کو متأخرین نے حسبِ ضرورت کسی ایسے واقعہ سے متعلق مستنبط کیا ہوتا ہے جس کے سلسلہ میں صاحبِ مذہب سے کوئی روایت نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ فقہ حنفی کی تدوین امام اعظمؒ کے زمانے میں ہوئی۔ لیکن عامی آدمی کو منقح اور واضح مسائل درکار رہوتے ہیں جن پر وہ عمل کر سکیں۔ اب تک کہ فقہ میں مفتیٰ بہ اور غیر مفتیٰ بہ اجتھادات شامل تھے۔ فقہ حنفی کا تحقیق کا عمل یہیں رُک نہیں گیا بلکہ اس فقہ پر بہت سی تحقیقات ہوئیں تا کہ واضح اور منقح مسائل عام لوگوں تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ ان تمام فقہاء کو ان کی صلاحیتوں کی بناء پر سات طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا طبقہ: اجتہاد مطلق کے ساتھ اجتہاد فرمانے والے حضرات مجتہدین کاملین کا جیسے ائمہ اربعہ۔

دوسرا طبقہ: امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کا ہے، جیسے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ وغیرہم ہیں۔ ان کو مجتہدین فی المذہب کہا جاتا ہے اور یہ حضرات ادلہ اربعہ سے احکام شرعیہ کا استخراج فرماتے ہیں

،ان قواعد کے مطابق جن کو امام اعظمؒ نے مقرر فرمایا ہے۔ان کو متقدمین احناف بھی کہا جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ: متاخرین حنفیہ کے اکابرین کا ہے جیسے امام خصافؒ ،امام طحاویؒ اور امام کرخی۔ اور شمس الائمہ حلوائیؒ،امام سرخسیؒ ،اور امام بزدویؒ ،اور قاضی خان وغیرہم۔ یہ لوگ ان مسائل میں اجتہاد فرماتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی روایت نہیں اور یہ لوگ صاحب مذہب کی مخالفت پر قادر نہیں نہ اصول میں نہ فروع میں۔

چوتھا طبقہ: مقلدین میں سے اصحاب تخریج کا ہے جیسے ابوبکر احمد بن علی رازی وغیرہ۔ یہ حضرات کسی قسم کے اجتہاد پر قادر تو نہیں ہیں لیکن اجتہاد کے تمام اصول کا حاوی اور تمام مآخذ کو ضبط کرنے والے ہونے کی بناء پر کسی مجتہد کی اتباع میں کسی قولِ مجمل ذو وجہین کی تفصیل اور کسی حکمِ مبہم محتملِ امرین کی تشریح کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور چند نظیروں میں ایک دوسرے پر قیاس کرتے ہیں۔

پانچواں طبقہ: مقلدین میں سے اصحاب ترجیح کا ہے اور کفوی نے اس میں صاحب قدوری اور صاحب ہدایہ کو شمار کیا ہے اور ان کا کام چند روایات میں سے ایک کو دوسری روایت پر ترجیح دینا ہے۔

چھٹا طبقہ: ان مقلدین کا طبقہ ہے جو اقویٰ،قوی،ضعیف،ظاہرِ مذہب،ظاہرِ روایات اور روایاتِ نادرا کے مابین تمیز دینے پر قادر ہیں، لہٰذا ان کو اصحابِ تمیز کہا جاتا ہے۔جیسے شمس الائمہ کردری، جمال الدین حصیری، حافظ الدین نسفی ،اور متاخرین میں اصحابِ متون جیسے صاحبِ وقایہ، صاحبِ مختار اور صاحبِ مجمع وغیرہم۔ اور ان کی شان یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں اقوالِ مردودہ اور روایاتِ ضعیفہ کو نقل نہ کریں اور یہ طبقہ حضرات فقہاء کا ادنیٰ طبقہ ہے۔

ساتواں طبقہ: ان مقلدین کا ہے جو نہ استخراج احکام پر قادر ہیں نہ ترجیح پر نہ تمیز پر غلط وصحیح کے درمیان، یہ لوگ کتاب میں جو کچھ پاتے ہیں یاد کر لیتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ لوگ حضرات فقہاء میں داخل نہیں ہیں۔

فقہ حنفی کو دوسری فقہوں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ شخصی فقہ نہیں ہے، بلکہ شورائی فقہ ہے۔ یہ کسی امام کے اپنے مسند پر دیئے ہوئے فتوے نہیں ہیں۔امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کی مجلسِ شوریٰ میں چالیس (۴۰) علماء شامل ہوتے تھے۔حضرت امام ان سے پوری بحث وتمحیص کے بعد مسئلے میں رائے قائم کرتے تھے۔دوسرے اکابر علماء کا کہیں اختلاف ہوتو وہ بھی لکھا جاتا تھا۔اس طرح فقہ حنفی بہت سے

مباحث سے گذر کر منقح اور مرتب ہوئی۔ فقہ حنفی میں حضرت امام کے فتوے کے ساتھ ان کے شاگردوں کے فتاوے اور اجتہادات بھی ملتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ فقہ حنفی کوئی شخصی فقہ نہیں بلکہ یہ بلند مرتبہ ائمہّ مجتہدین کے مباحث سے گذر کر ایک مجتہدانہ غلبے کا نام ہے۔ پھر ان چالیس ائمہ میں سے دس بارہ حضرات کی ایک اور مخصوص مجلس تھی جس کے رکن امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ، داؤد طائیؒ، یوسف ابن خالدؒ، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہؒ، امام محمدؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور خود امام ابوحنیفہؒ تھے۔

(الجواہر المضئیہ ج ۱ ص ۱۴، بحوالہ امام ابوحنیفہؒ ص ۱۷۸)

اس مجلس تدوین فقہ کے متعلق امام وکیع بن جرّاح مشہور محدث تحریر فرماتے ہیں: ''امام ابوحنیفہؒ کے کام میں کس طرح غلطی باقی رہ سکتی تھی جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ابو یوسف، حفص بن غیاث، حبان، مَندِل جیسے ماہرین حدیث ان کے ساتھ تھے۔ اور لغت وعربیت کے ماہر قاسم بن معن یعنی عبدالرحمٰن ابن عبد اللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے جیسے شریک تھے۔ اور داؤد بن نصیر طائی، فضیل بن عیاض زہد اور تقویٰ اور پرہیزگاری رکھنے والے حضرات موجود تھے۔ لہذا جس کے رفقاء کار اور ہم نشین ایسے لوگ ہوں وہ غلطی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ غلطی کی صورت میں صحیح امر کی طرف واپس کرنے والے لوگ موجود تھے۔

(جامع المسانید ص ۳۳ بحوالہ امام اعظم ابوحنیفہؒ ص ۱۷۸) [فتاویٰ رحیمیہ ج ۴ ص ۲۳۳]

کیفیت تدوین فقہ:۔ اس اہم کام کو انجام دینے کیلئے آپ نے ہزاروں شاگردوں میں سے چالیس ماہرین اشخاص منتخب فرمائے اور ایک کمیٹی کی تشکیل کی جن کے مبارک اسماء یہ ہیں۔

(۱) امام زفرؒ بن ہزیل العنبری متوفی ۱۵۸ھ

احد الفقهاء والعبّاد

مات سنة ثمان وخمسين ومائة (ص ۱۰۵)

(میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۰۵)

(۲) امام مالک بن مغول الکوفی متوفی ۱۵۹ھ

مات سنة تسع وخمسين و مائة (ص ۲۰)

(تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۹)

(۳) امام داؤد طائی الکوفی متوفی ۱۶۰ھ

میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۵

مات سنة۱۶۰ (ص ۱۸۲)

(تہذیب ج۳ ص۱۸۲)

(۴) امام مَندِل بن علی الکوفی متوفی ۱۶۸ھ

میزان الاعتدال ج۶ ص۵۱۳

ولد سنة ثلاث و مائة

مات فی رمضان سنة ثمان (ص۲۶۷)

(تہذیب التہذیب ج۱۰ص۲۶۶)

(۵) امام نضر بن عبدالکریم متوفی ۱۶۹ھ

مات عند ابی یوسف فی سنة ۱۶۹ھـ

(تاریخ بغداد ج۱۵ص۳۷۵)

(۶) امام عمرو بن میمون بلخی متوفی ۱۷۱ھ

میزان ج۵ص۳۴۸

مات بالکوفه (ص۹۱)

(تہذیب التہذیب ج۸ ص۹۰)

(۷) امام حبان بن علی متوفی ۱۷۳ھ

مارأیت فقیها بالکوفة أفضل من حبان بن علی (ص۱۸۶)

مات سنة احدی وسبعین و مائة (ص۱۸۷)

(میزان ج۲ ص۱۸۶)

(۸) امام ابوعصمہ متوفی ۱۷۳ھ

اخذ الفقه عن ابی حنیفة

مات سنة ثلاث و سبعین ومائة (ص ۱۸۷)

(میزان ج۷ ص۵۵)

(۹) امام زہیر بن معاویہ الکوفی متوفی ۱۷۳ھ

میزان ج۳ ص۱۲۵

ولد فی سنة مائة (ص۳۱۱)

توفی سنة ثلاث اواربع و سبعین ومائة(ص۳۱۱)

(تہذیب التھذیب ج۳ ص۳۱۱)

(۱۰) امام قاسم بن (معن) معین الکوفی متوفی ۱۷۵ھ

مات سنته خمس و سبعین و مائة (۲۹۵)

(تہذیب التھذیب ج۸ ص۲۹۴)

(۱۱) امام حماد بن الامام اعظم متوفی ۱۷۶ھ

میزان ج۲ ص۳۵۹

(۱۲) امام مہّیاج بن بسطام متوفی ۱۷۷ھ

میزان ج۷ ص۱۰۳

مات سنة سبع و سبعین و مائة (ص۷۷)

(تہذیب التھذیب ج۱۱ ص۷۷)

(۱۳) امام شریک بن عبداللہ الکوفی متوفی ۱۷۸ھ

میزان ج۳ ص۳۷۲

ولد شریک سنة۹۰(ص۳۰۶)

مات۱۷۷ او ۱۷۸ (ص۳۰۶)

(تہذیب التھذیب ج۴ ص۳۰۴)

(۱۴) امام عافیہ بن یزید الکوفی متوفی ۱۸۰ھ

له ترجمة طویلة فی تاریخ بغداد(ص۱۵)

(میزان ج۴ ص۱۵)

تہذیب التھذیب ج۵ ص۵۶

عافیة بن یزید الاودی کان اصحاب ابی حنیفة یخوضون معه فی المسألة،واذا لم یحضر عافیة قال ابو حنیفة "لاترفع مسألة حتی عافیة ،فاذا حضر ووافقهم قال أثبتوها" (الجواهر ج ۱ ص ۲۶۷).یقضی فی عسکر المهدی سنة (۱۶۱)(تاریخ بغداد ج

۱۴ ص ۲۵۴)

(۱۵) امام عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ

مات احدیٰ و ثمانین و مائة (ص ۳۴۰)

(تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۳۸)

(۱۶) امام ابویوسف (یعقوب بن ابراہیم) متوفی ۱۸۲ھ

میزان ج ۷ ص ۲۷۲

(۱۷) امام محمد بن نوح متوفی ۱۸۲ھ

میزان ج ٦ ص ۳۵۷ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۵۱۹

(۱۸) امام ہشیم بن بشیر السلمی متوفی ۱۸۳ھ

مولده سنة أربع و مائة (ص ۹۰)

(میزان ج ۷ ص ۹۰)

ولد فی سنة أربع و مائة (ص ۵۵)

مات فی شعبان سنة ثلاث و ثمانین ومائة (ص ۵۵)

(تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۵۳)

(۱۹) امام ابوسعید یحییٰ بن زکریا الکوفی متوفی ۱۸۴ھ

میزان ج ۷ ص ۱۷۵

و کان یعد فی فقهاء محدثی اهل الکوفة (ص ۱۸۴)

مات سنة اربع (ص ۱۸۴)

(تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۸۳)

(۲۰) امام فضیل بن عیاض متوفی ۱۸۷ھ

میزان ج ۵ ص ۴۳۹

ولد بخراسان وقدم الکوفة وانتقل الیٰ مکّه (ص ۲۵۷)

مات سنة سبع و ثمانین و مائة (ص ۲۵۷)

مات سنة ست و ثمانین و مائة (ص ۲۵۷)

(تہذیب التہذیب ج۸ ص۲۵۶)

(۲۱) امام اسد بن عمرو متوفی ۱۸۸ھ

صحب الامام ابا حنیفۃ وتفقہ علیہ (ص۳۶۳)

(میزان ج۱ ص۳۶۳)

(۲۲) امام محمد بن الحسن ابو عبداللہ متوفی ۱۸۹ھ

کان من بحور العلم والفقہ (ص ۱۰۷)

(میزان ج۶ ص ۱۰۷)

(۲۳) امام علی بن مسہر ابوالحسن الکوفی متوفی ۱۸۹ھ

مات سنۃ تسع و ثمانین و مائۃ (ص۳۲۴)

(تہذیب التہذیب ج۷ ص۳۲۳)

(۲۴) امام یوسف بن خالد متوفی ۱۸۹ھ

بصیرا با لرای والفتویٰ (ص۲۹۴)

(میزان ج۷ص۲۹۴)

مات سنۃ تسع و ثمانین و مائۃ (ص۳۵۹)

(تہذیب التہذیب ج۱۱ ص۳۵۹)

(۲۵) امام عبداللہ بن ادریس متوفی ۱۹۲ھ

مارأیت بالکوفۃ رجلاً افضل منہ (ص۱۳۰)

ولدت سنۃ ۱۱۰ (ص۱۲۹)

مات اثنین و تسعین و مائۃ (ص۱۲۹)

(تہذیب التہذیب ج۵ ص۱۲۸)

(۲۶) امام فضل بن موسیٰ متوفی ۱۹۲ھ

میزان ج۵ ص۴۳۷

کان مولدہ سنۃ خمس عشرۃ و مائۃ (ص۲۵۰)

مات سنۃ اثنتین و تسعین و مائۃ (ص۲۵۰)

(تہذیب التہذیب ج۸ ص۲۴۹)

(۲۷) امام علی بن طبیان (ظبیان) متوفی ۱۹۲ھ

میزان ج۵ ص۱۶۳

روی عن ابی حنیفة (ص۲۹۰)

(تہذیب التہذیب ج۷ ص۲۹۰)

(۲۸) امام حفص بن غیاث متوفی ۱۹۴ھ

احد الائمة الثقات (ص۳۳۱)

مات حفص سنة اربع وتسعین ومائة (ص ۳۳۲)

(میزان ج۲ ص۳۳۲)

ولدت ۱۱۷ھ (ص۳۷۵)

مات سنة ۱۹۴ (ص۳۷۵)

مات سنة اثنتین وسبعین ومائة (ص ۱۹۲)

(تہذیب التہذیب ج۲ ص۳۷۳)

(۲۹) امام وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ

میزان ج۷ ص۱۲۶

کوفی ولدت سنة ثمان وعشرین و مائة (ص۱۱۴)

مات سنة سبع تسعین و مائة (ص۱۱۴)

(تہذیب التہذیب ج۱۱ ص۱۰۹)

(۳۰) امام ہشام بن یوسف متوفی ۱۹۷ھ

مات سنة سبع و تسعین و مائة (ص۵۲)

(تہذیب التہذیب ج۱۱ ص۵۱)

(۳۱) امام یحیٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ

میزان ج۷ ص۱۸۲

ولدت سنة عشرین ومائة اوّلها (ص۱۹۲)

مات سنته ثمان و تسعین و مائة (ص۱۹۲)

(تہذیب التھذیب ج۱۱ ص۱۸۹)

(۳۲) امام شعیب بن اسحاق متوفی ۱۹۸ھ

روی عن ابی حنیفة و تمذھب له (ص ۳۱۵)

مات ۱۹۸ (ص ۳۱۶)

(تہذیب التھذیب ج۴ ص۳۱۵)

(۳۳) امام ابوحفص بن عبدالرحمٰن متوفی ۱۹۹ھ

میزان ج۷ ص۳۵۶

(۳۴) امام ابومطیع بلخی (حکم بن عبداللہ) متوفی ۱۹۹ھ

میزان ج۷ ص۴۲۸

صاحب ابی حنیفةؒ (ص۳۳۹)

مات سنة تسع وتسعین ومائة (ص ۳۴۰)

(میزان ج۲ ص۳۳۹)

(۳۵) امام خالد بن سلیمان متوفی ۱۹۹ھ

ابو معاذ البلخی (ص۴۱۳)

(میزان ج۲ ص۴۱۳)

احد من عده الامام للفتوی، مات۱۹۹ھ ص(۲۲۹)

(الجواھر ج۱ص۲۲۹)

(۳۶) امام عبدالحمید (ابن عبدالرحمٰن) متوفی ۲۰۳ھ

میزان ج۴ ص۲۵۲

روی عن ابی حنیفة و جماعة (ص۱۱۰)

مات اثنتین و مائتین (ص۱۱۰)

(تہذیب التھذیب ج۶ ص۱۰۹)

(۳۷) امام حسن بن زیاد متوفی ۲۰۴ھ

تفقه علی ابی حنیفة (ص ۲۳۹)

مات سنة أربع ومائتین (ص ۲۳۹)

(میزان ج۲ ص۲۳۹)

(۳۸) امام ابوعاصم النبیل (ضحاک بن مخلد الشیبانی) متوفی ۲۱۲ھ

میزان ج۳ ص۴۴۵

تذکرة الحفاظ لِلذهبي ج۱ ص۳۳۴، ثلاثیات بخاری

مات أربع و عشره و مائتین (۴۱۷)

(تہذیب التھذیب ج۴ ص۴۱۵)

(۳۹) امام مکی بن ابراہیم متوفی ۲۱۵ھ

روی عن ابی حنیفة ومالک (ص۲۶۲)

مات سنة خمس عشرة ومأتین (ص۲۶۳)

(تہذیب التھذیب ج۱۰ ص۲۶۲)

(۴۰) امام حماد بن دلیل متوفی ۲۱۵ھ

میزان ج۲ ص۳۵۹

روی عن ابی حنیفه واخذ عنه الفقه

رجل اعمی من اصحاب ابی حنیفة (ص۸)

(تہذیب التھذیب ج۳ ص۸)

یہ حضرات سب کے سب درجۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔ پھر ان چالیس میں سے دس بارہ حضرات کی ایک اور مخصوص مجلس تھی جس کے رُکن امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ، داؤد طائیؒ، یوسف بن خالدؒ، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہؒ، امام محمدؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، اور خود امام ابوحنیفہؒ تھے۔

(الجواہر المضیۂ ج۱ ص۱۴ بحوالہ اماِ اعظم ابوحنیفہؒ ص۱۷۸)

امام ابوحنیفہؒ کا استنباطِ مسائل کا طریقہ | امام ابوحنیفہؒ نے استنباطِ مسائل کا یہ طریقہ مقرر کیا کہ اولاً کتاب اللہ پھر سنتِ نبویہ پھر آثار صحابہ اور اس کے بعد قیاس۔ امام صاحب کی نظر احادیث پر بہت

دوررس تھی، وہ حدیث کے قوی، ضعیف، مشہور، آحاد کے علاوہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ آخری امر جس پر جناب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا ہے وہ کیا تھا۔ اور مسائل کے استنباط میں امام صاحب سوچ سوچ کر اس قسم کی جزئیات پر بھی بحث کرتے تھے کہ جن کا وجود ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ اسی وجہ سے امام صاحبؒ نے مجلسِ تدوینِ فقہ میں ان تمام مسائل پر بحث فرمائی کہ جن کے وقوع کا امکان ہوسکتا تھا۔ آپ کے اردگرد تلامذہ کا مجمع ہوتا اور ہر شخص کو احادیث و آثار اور اجماع و قیاس کی روشنی میں آزادی سے گفتگو و بحث کا موقع دیا جاتا تھا۔ اور امام صاحب کے سامنے سب ہی لوگ اپنے اپنے دلائل بیان کرتے اور بحث میں بسا اوقات ان کی آواز بلند ہو جاتی تھی اور بحث کے دوران خود امام صاحب سے (جو سب کے مسلّم شیخ اور استاذ تھے) بھی بعض حضرات اختلاف کر بیٹھتے اور یہاں تک کہہ دیتے کہ آپ نے فلاں دلیل میں خطا کی ہے۔ بعض اجنبی لوگ امام صاحب سے کہتے کہ آپ اتنی بے باکی سے بات کرنے والوں کو کیوں نہیں روکتے؟ تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے خود ان کو آزادی دی ہے اور ان کو اس امر کا عادی بنادیا ہے کہ کسی سے مرعوب نہ ہوں اور یہ لوگ ہر ایک کے حتی کہ میرے دلائل پر بھی نکتہ چینی کریں تاکہ صحیح بات بالکل منقح ہو کر سامنے آجائے۔

بہرحال اس طرح آپ جزئیات پیش فرماتے اور جواب حاصل کرتے، اگر سب کا جواب ایک ہی ہوتا تو مسئلہ اسی وقت قلم بند کرلیا جاتا۔ ورنہ پھر بحث کا سلسلہ جاری رہتا اور جو بھی آخر میں فیصلہ ہوتا وہی بات قرار پاجاتی۔ کبھی کبھی ایک مسئلہ پر مہینوں گذر جاتے۔ جب کلام بہت طویل ہو جاتا تو آخر میں امام صاحبؒ بحیثیتِ صدرِ مجلس تقریر شروع فرماتے اور سب دم بخود ہو کر ہمہ تن متوجہ ہو کر امام صاحبؒ کے فرمودات سنتے اور آپ ایسا محکم فیصلہ فرماتے کہ سب اُسے تسلیم کرلیتے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بعض اراکین اپنی رائے پر قائم رہتے تو اس صورت میں سب کے اقوال قلم بند کرلئے جاتے تھے۔ تقریباً بائیس (۲۲) سال کی مدّت میں امام صاحب نے قانونِ اسلامی کو مدوّن کرلیا۔ یہ کتابیں کتبِ ابی حنیفہؒ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ مجموعہ ۸۳ ہزار دفعات پر مشتمل تھا، جس میں ۳۸ ہزار مسائل عبادات کے متعلق تھے۔ باقی ۴۵ ہزار مسائل کا تعلق معاملات اور عقوبات سے تھا۔

(از امام ابوحنیفہؒ ملخص مؤلف حضرت مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری مدّ ظلہٗ، وانوار الباری شرح بخاری مصنّفہ حضرت مولانا سیّد احمد رضا خاں بجنوری دامت برکاتہم)

امام صاحب کا یہ مدوّن شدہ قانون اس وقت کے تمام علماء اور والیانِ ریاست کے کام آیا۔

عدالتوں میں سرکاری طور پر داخل کرلیا گیا اور اسی کے مطابق فیصلے ہونے لگے۔ یحییٰ ابن آدم فرماتے ہیں: **قضٰی به الخلفاءُ و الائمةُ والحکام و استقرَّ علیه الامرُ** خلفاء، حکّام اور ائمہ امام صاحب کے مدوّن کردہ فقہ کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔ بالآخر اسی پر عمل ہونے لگا۔ (مؤفق ج ۲ ص ۴۱)

و قال محمد بن اسحاق الندیم فی "الفهرست": وا لعلمُ برّاً وبحرًا و شرقاً وغرباً بُعداً و قُرباً تدوینه رضی اللّٰه عنه، یعنی برّ وبحر، شرق وغرب، دور اور نزدیک ہر جگہ کا علم امام ابوحنیفہؒ کی تدوین کا ثمرہ ہے۔ **(بحواله فقه اهلِ العراق وحدیثهم. للعلّامة زاهد الکوثریؒ. متوفی ۱۳۷۱ھ ص ۵۷) و قال بعض الائمة لم یظهر لأحد من أئمة الإسلام المشهورین مثل ما ظهر لابی حنیفة من الاصحاب و التلامیذ و لم ینتفع العلماءُ و جمیع الناس بمثل ما انتفعوا بهٖ و باصحابهٖ فی تفسیر الاحادیث المشبهة و المسائل المستنبطة والنوازل والقضاء و الاحکام .**

یعنی اسلام کے مشہور اماموں سے کسی امام کو اتنے زیادہ رفقاء وتلامذہ نصیب نہیں ہوئے جتنے امام ابوحنیفہؒ کو ہوئے اور علماء اور تمام لوگوں نے مشکل احادیث کی تشریح اور مستنبط مسائل کی تخریج اور احکام کے سلسلہ میں جتنا ان سے اور ان کے تلامذہ سے فائدہ اٹھایا اتنا کسی اور سے منتفع نہیں ہوئے (**الخیرات الحسان بحواله فقهُ اهلِ العراقِ و حدیثهم ص ۵۷**) .

قدیم زمانہ سے لیکر آج تک امّت کا ایک بڑا طبقہ مذہبِ حنفی کا پیرو رہا ہے، چنانچہ محدث حافظ ابن اثیر جزری شافعی جامع اصول کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: **لو لم یکن للّٰهِ سِرٌّ خَفّیٌ لما کان شطر هٰذهِ الامّةِ من أقدم عهدٍ إلیٰ یو منا هٰذا یعبدون اللّٰه سبحانه علیٰ مذهب الإمام الجلیل (ای ابی حنیفةؒ)** یعنی اس میں خدا کا کوئی مخفی راز ہے کہ اس امّت کا نصف سے زیادہ حصّہ قدیم زمانے سے لیکر آج تک امام اعظمؒ کے طریقہ پر خدا کی عبادت کررہا ہے۔ (یعنی مسلکِ حنفی کا پیرو ہے)

(بحوالہ فقہ اہل العراق وحدیثہم ص ۵۷)

محدث ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں: **و بالجملة فا تباعهُ اکثر من اَتْباعِ جمیع الائمة من علماء الامّة کما انّ اَتْباعَ النبی ﷺ اکثر من اَتباعِ سائر الانبیاء و قد وَرَدَ انّهم ثلثَا اهلِ الجنّة والحنفیةُ ایضاً تجی ثُلُثَی المؤمنین.** یعنی حاصل کلام امام

ابوحنیفہؒ کے متبعین دیگر ائمہ کے متبعین سے زیادہ ہیں جس طرح حضور اقدس ﷺ کے متبعین دیگر انبیاء کے متبعین سے بہت زیادہ ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اہل جنت کے دوثلث (۲/۳) آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی امّت میں سے ہوں گے۔ اسی طرح امت محمدی کے دوثلث حنفی ہیں۔
(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ا ص ۲۷، تذکرہ الامام اعظم ابی حنیفہ مطبوعہ ملتان، پاکستان)۔

امام اعظمؒ کے حاسدین کی تلبیسات

(۱) جب یہ حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ فقہ حنفی شورائی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کی چالیس (۴۰) ائمہ مجتہدین کی ایک کمیٹی تھی جو کہ اجتہادی امور پر بحث کر کے فیصلہ کرتی تھی، تو حاسدینِ امام اعظم برملا کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ مذکورہ کمیٹی میں جن لوگوں کے نام پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے ائمہ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے (عیاذاً باللہ)۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے حاسدین کا طرز امام ابوحنیفہؒ کی تنقیص میں وہی ہے جو آج کل کے فُسّاق وفجّار کا ہے، یا جیسا مخالفینِ اسلام کا پروپیگنڈہ کا ڈھنگ ہے کہ کسی بات کی تحقیق کے بغیر جھوٹ بلکہ بے جا الزامات کی تشہیر کردی جاتی ہے۔

اسلامی علوم وفنون میں ایک فن نمایاں مقام رکھتا ہے، جو علم وفن کی زبان میں ''اسماء الرجال'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علم معروف کی وہ قسم ہے جس کی بنیادیں خود قرآن وحدیث میں موجود ہیں اوران بنیادوں پر علمائے اسلام نے جو عمارت کھڑی کی وہ اپنی عظمت و بلندی میں آسمان کے ہم عنان نظر آتی ہے۔ ''احتیاط وتحقیق'' راویوں کے حالات اوران سے متعلق امور میں بحث وتمحیص احادیث اوران میں بھول چُوک یا الٹ پھیر کے امکان کی چھان بین کیلئے جو کوششیں بروئے کار لائی گئی ہے ان میں بہت بڑا حصہ محدثین کا ہے، انہوں نے زبردست کوششوں کے ذریعے اس بے مثال علم کو ایجاد کیا، جو اسلام کا سرمایۂ افتخار ہے، جس کی فضیلت، افادیت، دقت وباریکی اور سائنٹیفک معیار پراس کی تنقیدی متانت کا اعتراف دوستوں سے پہلے دشمنوں نے کیا ہے۔''

امام ابوحنیفہؒ کے زمانے سے آج تک چالیس رکنی فقہی کمیٹی کے ارکان کے جو نام پیش کیے جاتے ہیں ہر زمانے میں ان کی توثیق کی گئی ہے۔ کیفیتِ تدوینِ فقہ میں تشکیل شدہ کمیٹی کے جو ارکان کے نام پیش کئے گئے ہیں ان ارکان کے وفات کے سنوات، ان کا کوفہ میں موجود ہونا اوران کا امام اعظم ابوحنیفہؒ سے تعلق ہونا ''اسماء الرّجال'' کی کتابوں ''میزان الاعتدال اور تہذیب التہذیب'' سے

تصدیق کر کے ان کتابوں کے صفحات کے حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اگر یہ حوالہ جات جھوٹے ہیں تو اس سے اسماء الرجال کی کتابوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے اور ان کی تکذیب عام طور پر اسلام دشمن عناصر ہی کرتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ ان کے مشہور و معروف شاگرد امام محمد بن حسنؒ کی وفات ۱۸۹ھ میں ہوئی۔ یعنی امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے ۳۹ اُنتالیس سال بعد۔ مذکورہ کمیٹی کے آخری ارکان امام مکی بن ابراہیم اور امام حماد بن دُلیل کی سن وفات ۲۱۵ھ ہے۔ یعنی امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے ۶۵ سال بعد۔ اور امام مکی بن ابراہیم امام بخاریؒ کے ایسے مشہور اساتذہ میں سے ہیں کہ صحیح بخاری میں ثلاثیات مکی بن ابراہیم کے ذریعہ مروی ہیں۔ اور مکی بن ابراہیم کے بارے میں تہذیب التہذیب ج ۱ص ۲۶۲ پر تحریر ہے کہ ''روی عن أبی حنیفة و مالک ''یعنی انھوں نے امام ابوحنیفہؒ سے اور امام مالکؒ سے روایات لی ہیں۔ اور اسی پر تحریر ہے ''روی عنه البخاری یعنی ان سے امام بخاری نے روایت لی ہے۔'' اور انہی مکی بن ابراہیم کے بارے میں تحریر ہے ''مات سنة خمس عشرة و مائتین یعنی ان کی وفات ۲۱۵ھ میں ہوئی (ص ۲۶۳)۔'' اور تہذیب التہذیب کے اسی صفحہ پر تحریر ہے کہ مکی بن ابراہیم کی عمر تقریباً سو (۱۰۰) سال ہوئی۔ یعنی مکی بن ابراہیم جن کا انتقال امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے آخر میں ہوا ان کی عمر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے انتقال کے وقت تقریباً پینتیس (۳۵) سال تھی۔ حاسدین امام ابوحنیفہؒ حسد میں یہ جملہ تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ ارکان ان کے زمانے میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یہ جملہ صرف امام ابوحنیفہؒ کی تنقیص نہیں ہے بلکہ امّت مسلمہ کے اس علمی کارنامے کی توہین ہے جس سے ساری دنیا عاجز ہے۔ یعنی علم اسماء الرّجال کی توہین ہے۔ اس تنقیص کے ذریعے وہ امت مسلمہ کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں اس لیے انھیں توبہ کر کے اس فعل سے باز آجانا چاہئے۔

(۲) امام اعظم ابوحنیفہؒ کے سب سے بڑے حاسدین کا طبقہ جنھیں غیر مقلدین کہا جاتا ہے، جب ان کے سامنے تقلید کی دلیل میں قرآن کریم کی آیت ''یا ایُّھا الّذین اٰمنوا اطیعُو اللّٰہ و اطیعوا الرَّسُول و اُولی الامْرِ مِنکُمْ۔ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور تم میں سے جو اولی الامر ہیں ان کی''۔ تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ لوگ ادھوری آیت پیش کرتے ہو۔ آگے ہے ''فاِنْ تنازَعْتُمْ فی شیءٍ فرُدّوہُ اِلی اللّٰہِ و الرّسولِ اِن کنتُم تومنون

بِاللّٰہِ والیومِ الآخِرِ. ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تاوِیْلاً ○ (سورۂ نساء آیت ۵۹) ترجمہ: اگر تم کسی چیز میں منازعت اختیار کرو تو اسے لوٹا ؤ اللہ اور رسول کی طرف اگر تم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہ زیادہ بہتر ہے اور ان کا انجام خوشتر ہے۔''

درج بالا مقالہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ فقہ حنفی شورائی ہے اور تدوینِ فقہ کمیٹی نے ان تمام مسائل کو جو انھیں پیش آئے اسے اپنی بحث میں اللہ اور رسول کی طرف دلائل سے لوٹا دیا ہے۔ اسی کے متعلق امام وکیع بن جرّاح مشہور محدث تحریر فرماتے ہیں''امام ابوحنیفہؒ کے کام میں کسطرح غلطی باقی رہ سکتی تھی جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ابو یوسف، حفص بن غیاث، حبان، مَندِل جیسے ماہرین حدیث ان کے ساتھ تھے۔ اور لغت وعربیت کے ماہر قاسم بن معن یعنی عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے جیسے شریک تھے۔ اور داؤد بن نصیر طائی، فضیل بن عیاض زہد اور تقویٰ اور پرہیزگاری رکھنے والے حضرات موجود تھے۔ لہذا جس کے رفقاء کار اور ہم نشین ایسے لوگ ہوں وہ غلطی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ غلطی کی صورت میں صحیح امر کی طرف واپس کرنے والے لوگ موجود تھے۔

(جامع المسانیدص ۳۳ بحوالہ امام اعظم ابوحنیفہؒ ص ۱۷۸) [فتاویٰ رحیمیہ ج ۴ ص ۲۳۳]

تحقیق واجتہاد کے نام پر آج کل کے غیر مقلدین کس طرح منازعت کرسکتے ہیں جب کہ وہ لوگ مجتہد کے درجہ پر نہیں پہنچ سکے، بلکہ وہ تو اجتہادی مسائل تک کا انکار کرتے ہیں۔ اجتہادی مسائل اور فقہ کا انکار کرتے کرتے سو (۱۰۰) سال گذر چکے ہیں، ان غیر مقلدین کی کتابیں فقہ کی تنقیص اور اسے اسلام مخالف ثابت کرنے سے بھری ہوئی ہیں، پھر کس طرح وہ لوگ مذکورہ آیت کا حوالہ دے کر منازعت کو صحیح قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں؟ اصل میں ان غیر مقلدین کا اجتہادی مسائل میں یہ اختلاف، اختلاف نہیں ہے بلکہ اہل حق کی مخالفت ہے جس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

''تحقیق اور حقِ تحقیق'' کے عنوان سے تجلیات صفدر جلد اول میں تحریر ہے کہ''اجتہادی مسائل پر تحقیق کر کے اجتہاد کرنا مجتہد کا کام ہے۔ اگر غیر مجتہد اجتہاد کا کام کرے تو وہ اس کا اہل نہیں۔ رسول اقدس ﷺ سے کسی سائل نے قیامت کے بارہ میں سوال کیا فرمایا، جب امانت ضائع کی جائے تو قیامت کا انتظار کر۔۔۔۔سائل نے عرض کیا حضرت امانت کس طرح ضائع ہوتی ہے فرمایا جب کوئی امر نااہلوں کے سپرد کردیا جائے تو قیامت کا انتظار کر (صحیح بخاری ج ا ص ۱۴۱)۔ آپ ﷺ نے کیسی عالم گیر حقیقت کا انکشاف فرمایا۔ کیا جب ڈاکٹری نسخے وکیل لکھنا شروع کردیں تو ڈاکٹری پر قیامت نہیں

آجائے گی، جب سونے کی جانچ سناروں کی بجائے کمہار کرنے لگیں تو قیامت نہیں آجائے گی۔ اسی طرح جب دین کی تشریحات نااہل کریں گے تو کیا دین پر قیامت نہ آئے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا دین کا علم (کتاب وسنت کے الفاظ) نہیں اٹھایا جائے گا (بلکہ کتاب وسنت یہیں رہے گی) مگر اس کے علماء اٹھا لئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کوئی باقی نہ رہے گا تو لوگ ناواقفوں کو اپنا دینی پیشوا بنالیں گے وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰)۔ مجتہد ہر اجتہاد میں اجر پاتا ہے اگر اس کا اجتہاد درست نکلا تو دو اجر اور اگر اجتہاد خطا نکلا تو ایک اجر ملے گا ہاں جو نااہل ہو اس کا اجتہاد کرنا کسی حال میں جائز نہیں بلکہ گنہگار ہوگا۔ ''مجتہدین کی مخالفت'' کا نام ''تحقیق'' نہیں بلکہ ''نااہل کی مخالفت'' ہے۔ رسول اقدس ﷺ جب بیعت لیتے تو اس میں ایک یہ عہد لیتے ''ان لا ننازع الامر اهله ترجمہ: ہم اہل امر سے منازعت نہیں کریں گے (متفق علیہ)۔'' بڑی عجیب بات ہے کہ حدیث جس کی مخالفت کرے اس کا نام ''تحقیق'' رکھا جائے۔'' مزید تحریر ہے کہ

''مجتہد سے اگر خطا بھی ہو جائے تو اسے اجر ملتا ہے لیکن نااہل کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے، اگر وہ صحیح بات بھی پائے تو اسے اجر کی بجائے گناہ ہوگا۔ رسول اقدس ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کی وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے (ترمذی) اور فرمایا جس نے قرآن میں اپنی رائے لگائی اور درست بات بھی پالی تو بھی وہ گنہگار رہے (ترمذی)۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ مجتہد ہر اجتہاد میں اجر پاتا ہے اگر اس کا اجتہاد درست نکلا تو دو اجر کا مستحق ہے کہ ایک اجر اجتہاد کا دوسرا اصابت کا اور اگر اجتہاد خطا نکلا تو بھی ایک اجر اجتہاد کا ملے گا۔ ہاں جو نااہل ہو اس کو اجتہاد سے حکم کرنا کسی حال میں جائز نہیں بلکہ وہ گنہگار ہے۔ اس کا حکم نافذ بھی نہ ہوگا اگرچہ حق کے موافق ہو یا مخالف۔ کیونکہ اس کا حق کو پالینا محض اتفاقی ہے کسی اصل شرعی پر مبنی نہیں پس وہ تمام احکام میں گنہگار ہے۔ حق کے موافق ہوں یا مخالف اور اس کے نکالے ہوئے تمام احکام مردود ہیں اس کا کوئی عذر شرعاً مقبول نہیں وہ دوزخی ہے (شرح مسلم ج ۲ ص ۷۶)۔ افسوس ہے کہ اہل قرآن اور اہل حدیث نے (نیز تمام غیر مقلدین نے) اس کبیرہ گناہ جس کا ٹھکانہ دوزخ کے سوا کہیں نہیں ''تحقیق'' رکھا ہے اور اس کو عمل بالقرآن اور عمل بالحدیث کہتے ہیں۔''

اسلامی کتب خانے

(نویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جهنی ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

٦-اسحاق بن ابراہیم موصلی متوفی ۲۳۵ھ=۸۴۹ء کا کتب خانہ:

ان کے پاس ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا، ابن خلکان نے ان کے احوال میں لکھا ہے کہ: ''وہ بہت زیادہ کتابوں کا مالک تھا، ابوالعباس ثعلب کا کہنا ہے کہ اسحاق موصلی کے ہاں لغات عرب کے ایک ہزار اجزا تھے، اور سب کے سب اس کے سنے ہوئے تھے، اور میں نے اسحاق کے گھر کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر اس سے زیادہ کتابیں نہیں دیکھیں، پھر ابن الاعرابی کے گھر کی کتابیں تھیں''۔ (١)

۷-فتح بن خاقان متوفی ۲۴۷ھ=۸۶۱ء کا کتب خانہ:

اس کا شمار ان پرائیوٹ کتب خانوں میں تھا جو تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں مشہور تھے۔ فتح بن خاقان، عباسی خلیفہ متوکل کے عہد خلافت کے سربرآوردہ افراد میں تھا، بہت زیرک، سمجھ دار اور باادب تھا، متوکل نے اس کو اپنا بھائی بنالیا تھا، اور اپنے آل اولاد پر اس کو فوقیت دیتا تھا، اس کے گھر کوفہ وبصرہ کے علماء اور اہل شہر حاضر ہوا کرتے تھے، فتح بن خاقان -علیہ الرحمہ- کی عادت تھی کہ وہ اپنے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب رکھتا تھا، جب وہ متوکل کے دربار میں حاضر ہوتا، اور متوکل وضوخانے جانے کے لیے اٹھتا، تو اپنی آستین یا پائتابے سے کتاب نکالتا اور متوکل کی واپسی تک مصروف مطالعہ رہتا۔

اس کی نسبت ابن الندیم نے لکھا ہے کہ علی بن یحییٰ منجم نے اس زمانے میں موجود مختلف علمی اقسام کے ایک شاندار کتب خانہ کی تشکیل میں فتح بن خاقان کی مدد کی تھی، ابن الندیم نے اس کتب خانے کی یہ کہہ کر تعریف کی ہے کہ: ''فتح کتابیں جمع کرنے کا گرویدہ تھا، چنانچہ اس کے پاس اتنا قابل

---

(١) وفیات الاعیان: ۲۰۴/۱

قدر کتب خانہ بن گیا تھا کہ اس سے زیادہ اور اس سے خوبصورت کتب خانہ دیکھا نہیں گیا''۔

۸-یعقوب بن اسحاق کندی متوفی ۲۵۵ھ = ۸۶۸ء کا کتب خانہ:

کندی نے اپنی جائے پیدائش کوفہ، اور بغداد میں علم حاصل کیا، اور علم کے مختلف فروع میں اپنی تصانیف کی وجہ سے اس نے بڑی شہرت پائی، اور عباسی خلیفہ مامون و معتصم کے عہد میں اس کا شہرہ دور دراز تک پھیلا۔ اس نے حساب، ہندسہ، نجوم، فلکیات، جغرافیہ، طبیعہ، سیاست، موسیقی، طب اور فلسفہ جیسے علوم میں اپنی فکری پیداوار کے ۲۶۵ مقالے اور بحثیں یادگار چھوڑی تھیں۔

کندی کا کتب خانہ بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، اس نے کتابوں کو جمع کرنے، نقل کرنے اور ان کی فراہمی کا غیر معمولی اہتمام کیا تھا اور اس کا کتب خانہ اس دور کے پرائیوٹ کتب خانوں میں اہم ترین کتب خانہ سمجھا جاتا تھا۔

۹-جاحظ کا کتب خانہ:

ابو عثمان عمرو بن بحر-متوفی ۲۵۵ھ = ۸۶۸ء رحمہ اللہ تعالی- کا شمار ان مشاہیر میں ہے جنھوں نے کتابوں سے محبت کی اور ان کی طرف سے دفاع کیا، اور ان کی تعریف کی اور بھرپور تعریف کی۔ جس کی شہادت اور ثبوت اس کی کتابیں اور تصانیف پیش کرتی ہیں۔ جاحظ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ: ''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب آئی ہو اور اس نے اس کو پورا پڑھا نہ ہو۔ حتی کہ وہ وراقوں کی دوکانیں کرائے پر لے لیا کرتا تھا اور مطالعہ کے لیے رات بھر اسی میں رہ جاتا تھا''۔

اس کا اپنا مشہور کتب خانہ بھی تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کی موت بھی اس کے اوپر کتابیں گر جانے سے ہوئی تھی، اس کی عادت تھی کہ وہ کتابوں کو دیوار کی طرح تہ بہ تہ رکھ دیا کرتا تھا، اور اسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا تھا، وہ اسی طرح بیمار بیٹھا ہوا تھا کہ کتابیں اس کے اوپر گریں اور اس کی موت کا سبب بن گئیں۔

۱۰-ابراہیم بن اسحاق حربی متوفی ۲۸۵ھ = ۸۹۸ء کا کتب خانہ:

یہ کتب خانہ لغت و ادب کے بارہ ہزار اجزاء پر مشتمل تھا۔ [۱]

۱۱-محمد بن نصر متوفی ۳۱۲ھ = ۹۲۴ء کا کتب خانہ:

اس نے اپنے بعد دو ہزار دینار سے زیادہ کی کتابیں چھوڑی تھیں۔ [۲]

(۱) معجم الادباء: ۱/ ۳۷-۳۹ (۲) المنتظم: ۹: ۷

۱۲- ابوالعباس جعفر بن محمد بن حمدان موصلی کا کتب خانہ:

شافعی فقیہ تھے، ۳۲۳ھ = ۹۳۵ء میں وفات پائی تھی۔ انھوں نے اپنے شہر موصل میں کتب خانے کی بنیاد ڈالی تھی، اور اس کا ''دارالعلم'' نام رکھا تھا۔ یاقوت حموی نے ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس شخص کا موصل میں ایک دولت خانہ تھا، جس میں تمام علوم کی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ یہ کتب خانہ روزانہ کھلتا تھا، اور انھوں نے اس کو ہر ایک طالب علم کے لیے وقف کر رکھا تھا، کہ کسی کو اس میں جانے سے روکا نہیں جاتا تھا''۔

ابن حمدان کی اس میں نشست اور لوگوں سے ملاقات ہوتی، ان کو اپنے اور دوسروں کے اشعار املا کراتا، پھر منتخب لطائف اور فقہ اور اس سے متعلق کچھ باتیں املا کراتا۔ (۱)

خاص خاص کتب خانے جن کا دروازہ لوگوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس کے کچھ اور نمونے حسب ذیل ہیں:

۱۳- ابن عقدہ کا کتب خانہ:

ان کا نام احمد بن محمد بن سعید تھا، ''ابن عقدہ'' کے نام سے معروف تھے، محدث تھے، ۳۳۲ھ = ۹۴۳ء میں وفات پائی تھی۔ انھوں نے اپنا کتب خانہ کوفہ میں قائم کیا تھا، بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا، تاریخی کتابوں میں اس کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ: ''انھوں نے اپنے کتب خانے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہا، تو اپنی کتابیں لے جانے کے لیے اجرت پر آدمی لیے، اور بار برداروں سے یہ طے کیا کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک بوری اٹھانے کا ایک دانق دیں گے۔ دانق: ایک درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے۔ ان کی اجرت کو جب وزن کیا تو سو درہم ہوئے۔ اور ان کی کتابوں کا بوجھ ۶۰۰ درہم تھا۔ (۲)

۱۴- قاضی ابن حبان کا کتب خانہ:

نیشاپور میں ۳۵۴ھ = ۹۶۵ء میں وفات پائی تھی، انھوں نے ایک کتب خانہ، ایک دارالعلم اور غریب الدیار طلبہ کے لیے ایک دارالاقامہ تعمیر کرایا تھا۔ ان طلبہ کے لیے روزینے جاری کیے تھے۔ ان کی کتابیں کتب خانے سے باہر نہیں لے جائی جاتی تھیں۔ (۳)

---

(۱) معجم الادباء: ۱/۴۲۰

(۲) تاریخ بغداد: ۵/۱۸، منتظم: ۷/۳۳۷، شذرات الذہب: ۳۳۲

(۳) الحضارۃ الاسلامیۃ فی القرن الرابع الہجری: ۲/۳۱۱

۱۵-وزیر ابوالفضل بن العمید کا کتب خانہ:

یہ کتب خانہ رے میں تھا، ابن العمید رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۳۵۵ھ = ۹۶۵ء میں ہوئی۔ ابن سکویہ مورخ نے لکھا ہے کہ اس میں بہت کتابیں تھیں: ''اس میں ہر علم اور حکمت وادب کی ہر قسم سے متعلق کتابیں تھی، جو ۱۰۰ ابوجھ کے بقدر تھیں''۔ (۱)

۱۶-حبشی بن معز الدولہ کا کتب خانہ:

ان کی وفات ۳۵۷ھ = ۹۶۷ء میں ہوئی تھی - رحمہ اللہ تعالیٰ -، ان کی املاک ضبط کر لی گئی تھیں، اس لیے کہ اس نے اپنے بھائی بغداد کے امیر کی نافرمانی کا ارادہ کیا تھا، تو جو چیزیں اس سے لی گئیں، اس میں پندرہ ہزار جلدوں پر مشتمل کتابیں تھیں، اجزاء اور غیر مجلد اس کے علاوہ تھیں۔

۱۷-ابوعلی بن سوار کاتب متوفی ۳۷۲ھ=۹۸۲ء رحمہ اللہ کا کتب خانہ:

عضدالدولہ کے درباریوں میں تھا، اس نے خلیج فارس کے ساحل پر شہر ''رام ہرمز'' میں ایک کتب خانہ قائم کیا، اسی طرح بصرہ میں بھی ایک کتب خانہ تعمیر کیا، اور اس میں آنے جانے اور پڑھنے اور نقل کرنے والوں کے لیے وظیفے جاری کیے۔

۱۸-ابن الندیم کا کتب خانہ:

محمد بن اسحاق نام تھا، ''الفہرست'' کا مصنف تھا، ۳۸۰ھ = ۹۹۰ء میں وفات پائی تھی، وراق تھا اور کتب فروشی کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا کتب خانہ بہت سی کتابوں پر مشتمل تھا، جن کو اس نے ''الفہرست'' میں ذکر کیا ہے۔ اور اس کتب خانے ہی نے اس بیش قیمت کتاب کی تصنیف میں اس کی مدد کی تھی۔

۱۹-اسماعیل بن عباد کا کتب خانہ:

۳۸۵ھ = ۹۹۵ء میں وفات پائی تھی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ صاحب بن عباد کے نام سے مشہور تھا، کیونکہ وہ ابن العمید کا رفیق ومصاحب تھا، اپنے استاذ سے زیادہ کتابوں کا شیدائی تھا، اور ان سے زیادہ ذخیرہ کر رکھا تھا۔ وزراء میں پہلا شخص ہے جو ''صاحب'' کے لقب سے ملقب ہوا۔ علم وادب کا دل دادہ تھا، متعدد ادباء واطباء اس کے خاص اور حاضر باش تھے، اس کا کتب خانہ چار سو ۴۰۰ اونٹوں کے بوجھ کے بقدر تھا۔ (۲) ابن خلکان نے ابوالفرج اصفہانی کے تذکرے میں اس کا یہ قول نقل کیا ہے

(۱) ظہر الاسلام: ۲۲۶/۲۰ (۲) معجم الادباء: ۸۴/۴

کہ: ''صاحب بن عباد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سفر میں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے میں مطالعہ کے لیے تیس اونٹوں پر کتب ادب بار کر کے لے جاتا تھا''۔ (۱)

یاقوت حموی نے صاحب ابن عباد کے کتب خانے میں موجود کتابوں کا احصاء کیا، تو وہ ۶۲۰۰ جلدوں پر مشتمل تھیں، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ کتابوں کی تعداد اور موضوعات کے لحاظ سے یہ ایک شاندار اور زبردست کتب خانہ تھا، ابوالحسن بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی زیارت کی تو دیکھا کہ دس جلدوں میں اس کی صرف فہرست ہے۔ (۲)

اس کے متعلق وِل ڈیورانٹ نے ''قصۃ الحضارۃ'' میں لکھا ہے: ''صاحب ابن عباد جیسے بعض وزیروں کے پاس اس قدر کتابیں تھیں، جتنی آج یورپ کے تمام کتب خانوں میں ہیں''۔ (۳)

۲۰-ابوجعفر علیہ الرحمہ کا کتب خانہ:

احمد بن ابراہیم بن ابی خالد الجزار القیر وانی نام تھا، چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کا طبیب ومؤرخ تھا، فراہمئ کتب میں اپنے وقت میں مشہور تھا، ابن جلجل نے اس کے حالات میں لکھا ہے: ''جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی پچیس قنطار کتابیں عمدہ اور غیر عمدہ پائی گئیں''۔ (۴)

۲۱-خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ:

ابوبکر بن علی نام تھا، ۴۶۳ھ=۱۰۷۳ء میں وفات ہوئی تھی، ۱۴ جلدوں پر مشتمل ''تاریخ بغداد'' جیسی مشہور کتاب کے مصنف تھے، ان کا کتب خانہ کتابوں سے معمور تھا، اس کو مسلمانوں پر وقف کردیا تھا، لیکن آخر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے جل کر تباہ ہوگیا۔ (۵)

۲۲-ابن النجار متوفی ۴۶۳ھ=۱۰۷۳ء رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ:

محبّ الدین محمد بن محمود بغدادی نام تھا، مورخ اور دارالسنۃ المستنصر یہ میں مدرس تھے۔ ان کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، جس کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ پر وقف کردیا تھا، اور ابن الساعی کو اپنے ترکہ کے سلسلے میں وصیت کی تھی، منجملہ اس وصیت کے یہ بھی تھا کہ: ''ایک ہزار دینار کے برابر کتابوں کی دو الماریاں نظامیہ پر وقف ہیں۔ بعد میں اس وصیت کو خلیفہ مستعصم نے نافذ کیا''۔ (۶)

(۱) معجم الادباء: ۱۵۰/۵ (۲) ایضاً: ۲۵۸/۶-۲۵۹ (۳) قصۃ الحضارۃ: ۱۷۰/۱۳
(۴) طبقات الاطباء: ۹۰ (۵) معجم الادباء: ۲۵۲/۱-۲۵۹
(۶) تاریخ علماء المستنصریۃ: ۳۳۳/۱-۳۳۸

۲۳-ابن الخشاب کا کتب خانہ:

عبداللہ بن احمد خشاب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۶۷ھ = ۱۱۷۷ء، کلام عرب کے بہت بڑے عالم؛ اورنحو،لغت، تفسیر اور حدیث وانساب کے شناور تھے،ان کی بہت سی تصانیف بھی ہیں۔ (۱)

ابن الخشاب کتابوں کے اور کتابیں جمع کرنے کے شیفتہ تھے،انھوں نے بہت سی کتابیں جمع کرر کھی تھیں، کتاب خریدنے کے لیے وہ چالاکی سے کام لیا کرتے تھے، جب کتابوں کے بازار میں جاتے اور کسی کتاب کوخریدنا چاہتے،تو لوگوں سے نظر بچاکر اس کا ایک ورق پھاڑ لیتے،اور کہتے کہ اس کا ورق نکلا ہوا ہے'' تا کہ لوگ اس میں دلچسپی نہ لیں، پھر کم دام میں اس کوخرید لیتے۔آخر عمر میں اپنی کتابیں اہل علم کے لیے وقف کردی تھی۔ (۲)

۲۴-ابن الفوطی شیبانی متوفی ۷۲۳ھ=۱۳۳۲ء کا کتب خانہ:

وہ مراغہ کے اس دارالرصد کا خازن تھا، جو۴ لاکھ جلدوں پر مشتمل تھا، پھر مستنصریہ کے اس کتب خانے کا خازن ہوا،جس میں اسی ہزار (۸۰۰۰۰) مجلد کتابیں تھیں،اس کا کتب خانہ اس زمانے کے قیمتی کتب خانوں میں سمجھا جاتا تھا،اس کا گھر اور کتب خانہ بغداد وغیرہ کے اہل علم وادب کا مرجع تھا۔ (۳)

۲۵-ابن عبدالحق کا کتب خانہ:

بغداد میں ۷۳۹ھ= ۱۳۳۸ء میں وفات پائی تھی،صفی الدین عبدالمؤمن بن عبدالحق نام ونسب تھا،مستنصریہ میں مدرس اور مراصد الاطلاع في أسماء الأمكنة والبقاع کے مصنف تھے۔ان کا اپنا ایک کتب خانہ تھا،جس کو مدرسہ مجاہدیہ پر وقف کردیا تھا،وہ اس وقت بغداد کا سب سے بڑا مدرسہ تھا۔ (۴)

اسی طرح مصر وشام میں بھی ذاتی کتب خانوں کا بہت اہتمام تھا،اگر چہ اس درجے کا نہیں تھا جواوپر ذکر کیے جاچکے ہیں،اوراس طرح پھیلے ہوئے نہیں تھے، پھر بھی ان علاقوں میں بعض ایسے ذاتی کتب خانے قائم کیے گئے،جن کو بعض وزراء اطباء اور منفرد شخصیات نے جمع کیا تھا، چنانچہ موفق ابن مطران متوفی ۵۸۷ھ = ۱۱۹۷ء کا ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا،ان کا نام موفق الدین بن مطران

---

(۱) معجم الادباء:۱۲/۴۹ (۲) ایضا:۶/۲۸۶-۲۸۷

(۳) تاریخ علماء المستنصرية:۱/۸۴-۱۱۵ (۴) ایضاً:۱/۱۸۳-۱۸۹

دمشقی تھا، ذہین اور زبان آور تھا، فن طب پر اس کی متعدد کتابیں ہیں، جو اس کے فضل وشرف پر دلالت کرتی ہیں، سلطان صلاح الدین کا علاج کیا تھا، فراہمی کتب کے سلسلے میں بڑا بلند حوصلہ تھا، حتی کہ جس وقت اس کی وفات ہوئی ہے، اس کے کتب خانے میں طب اور دیگر علوم سے متعلق قریب دس ہزار مجلد کتابیں تھیں، کتابوں کو نقل کرانے کا اس کو شدید اہتمام تھا، اس کی خدمت میں تین نسخہ نویس ہمہ وقت کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔ ابن مطران نے اپنے ہاتھ سے بھی بہت سی کتابیں نقل کی تھیں، اس کی نقل کی ہوئی متعدد کتابیں ابن ابی اصیبعہ نے بھی دیکھی تھیں، انھوں نے اس کی خوش خطی اور اعراب کی درستگی کی تعریف کی ہے۔(۱)

موفق الدین بہت مطالعہ کرنے والا تھا، بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کرتا تھا مگر تھکتا نہیں تھا، طبیعت کا شریف تھا، اکثر وبیشتر اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کو کتابیں دے دیا کرتا تھا، اس کے پاس چھوٹی چھوٹی جلدوں میں ہزاروں کتابیں تھیں، اس کی آستین میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب رہا کرتی تھی، بادشاہ کے دروازے پر یا جہاں کہیں بھی رہتا اس کے مطالعہ میں مصروف رہتا۔(۲)

یہی حال وزیر جمال الدین قفطی متوفی ٦٤٦ھ = ۱۲۴۶ء کا بھی تھا، اس کا نام جمال الدین ابوالحسن علی قفطی تھا، وزیر وقاضی تھا، مصر میں پیدا ہوا، اور حلب میں بود وباش اختیار کی، ''قاضی اکرم'' کے لقب سے معروف تھا، لغت ونحو، فقہ وحدیث، اصول وعلوم قرآن، منطق، ہندسہ اور تاریخ کا بہترین عالم تھا۔

''وفیات'' کے مصنف کتبی نے وزیر قفطی کے احوال میں لکھا ہے کہ: ''باوقار، سردار اور صدر نشین تھا، ناقابل بیان حد تک کتابیں جمع کر رکھی تھیں، اور دور دراز سے کتابیں فراہم کر رکھی تھیں، کتابوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور چیز کا آرزومند نہیں تھا، اس کا نہ کوئی گھر تھا، نہ گھر والی تھی، حلب کے حاکم ناصر کے لیے اپنی کتابوں کی وصیت کر دی تھی، جو پچاس ہزار دینار کی قیمت کے برابر تھیں، کتابوں کے ساتھ شیفتگی اور ان کی فراہمی میں اس کے عجیب وغریب واقعات ہیں''۔(۳)

(۱) ابن ابی اصیبعہ: ۱۷۵/۲ (۲) ایضاً: ۱۷۰/۲

(۳)(ا) فوات الوفیات: ۱۹۳/۲

جہاں تک مصر کا معاملہ ہے، تو اس کے مخصوص کتب خانوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں، اس علاقے میں چند بڑے تہذیبی مراکز کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا، اور چونکہ قاہرہ میں عالم اسلام کے عظیم ترین عالم کتب خانوں میں سے ایک تھا، اس لیے شاید وہاں کے باشندوں نے اپنا ذاتی کتب خانہ بنانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

عزیز باللہ فاطمی کے وزیر یعقوب بن کلس متوفی ۳۸۰ھ=۹۹۰ نے اپنا ایک کتب خانہ قائم کیا تھا، یہ شخص علوم وفنون کا دلدادہ تھا، اہل علم وادب کو ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتا تھا، یہ وزیر یہودی تھا، حلقہ بگوش اسلام ہو گیا تھا، اور انتھک کوشش کی تھی، یہاں تک کہ بہترین اور قابل نمونہ مسلمان بن گیا تھا۔

اس نے قرآن کریم کی کتابت کے لیے کچھ لوگوں کو اپنے محل میں رکھا تھا، اور کچھ لوگ حدیث وفقہ اور لغت وادب حتی کہ طب تک لکھنے کے لیے تھے، وہ نسخوں کا مقابلہ کرتے، اور قرآن پر اعراب اور نقطے لگاتے۔ (۱)

ابن کلس کو اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کا کتب خانہ اس کی بہت سی اپنی تصانیف پر مشتمل ہو، اسی طرح اس کو اس کی بھی خواہش رہا کرتی تھی کہ اپنے کتب خانے میں بعض علوم کے ماہر اہل علم کی ضیافت کرے، اور ان کو تصنیف وتالیف کی ترغیب دے، تا کہ اس کا کتب خانہ ہر علم وفن کی کتاب پر مشتمل ہو، اور اہل علم وطلب کو اس کے کتب خانے تک جانے کے لیے مجبور کرے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ اور شائقین مطالعہ کی ایک خاصی تعداد کی کتب خانے میں آمد ورفت رہا کرتی تھی، یہاں تک کہ مصری تمیمی شاعر نے مالک مکتبہ کی اس طرح تعریف کی ہے کہ: ''وہ ایک ایسا شخص ہے، جس کا ایک مہمان خانہ ہے، اور جس سے ملنے والے بارش کے قطروں کی طرح اترتے رہتے ہیں''۔ (۲)

ذاتی کتب خانوں میں ایک مبشر بن فاتک کا کتب خانہ بھی تھا، ان کی وفات پانچویں صدی ہجری کے آخر اور بارہویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوئی تھی، وہ مصر کے سربرآوردہ امراء اور اصحاب فضل وکمال میں تھا، اس کو ریاضی وحکمت کا بڑا وسیع علم تھا، پیشۂ طب سے وابستہ تھا، اور تحصیل علم وفراہمیٔ کتب میں بہت عالی حوصلہ تھا، علم دوست اور علماء نواز تھا، اس کا ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، جب سفر میں نہ ہوتا تو کتب خانے سے جدا نہ ہوتا، اور سوائے مطالعہ اور کتابت کے کوئی اور اس کا کام نہ تھا، کثیر التصانیف تھا، اس کے بارے میں ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ: ''اس نے اپنے قلم سے

(۱) وفیات الاعیان: ۱/۲۸ (۲) المكتب ودورها التربوي في مصر الفاطمية: ۱۰۰ – ۱۰۱

متقدمین کی بہت سی تصانیف لکھی تھیں''۔ (۱)

اس کی بیوی بھی ایک تعلیم یافتہ عورت تھی، لیکن کتابوں کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہوچکی تھی، لہٰذا جب مبشر کا انتقال ہوا، تو وہ اور اس کی باندیاں محل کے درمیان بنے ہوئے پانی کے ایک بڑے تالاب میں ان کو پھینکنے لگیں، بعد میں وہ کتابیں پانی سے نکالی گئیں، پھر بھی بہت سی اسی میں ڈوب کر رہ گئیں، یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے کاغذ کا رنگ تبدیل ہو کر خراب ہو گیا تھا۔

اس زمانے کے مصر کے مشہور ذاتی کتب خانوں میں مشہور مصری طبیب ابراہیم بن صوفان کا کتب خانہ تھا۔ خلفاء کا خدمت گزار تھا، اور اس کے اوپر ان کی بڑی عنایتیں تھیں، کتاب کی فراہمی اور ان کو نقل کرنے میں بلند ہمت تھا، ابن ابی اصیبعہ (۲) نے لکھا ہے: ''کہ ایک شخص کچھ کتابیں خریدنے کے لیے عراق سے مصر آیا، ایک دلال نے ایک بڑی رقم کے عوض دس ہزار کتابیں فروخت کے لیے پیش کیں۔ جب وزیر افضل بدر جمالی کو اس کی خبر ملی، جو کہ ایک علم دوست شخص تھا، تو اس نے چاہا کہ یہ کتابیں دیار مصر ہی میں رہیں اور کسی دوسری جگہ نہ منتقل ہوں، تو اس نے تاجر کو اپنے مال خاص سے ان کتابوں کی قیمت ادا کی، تا کہ وہ مصر ہی میں رہ جائیں''۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب ۵۱۵ھ میں اس وزیر کی وفات ہوئی، تو خلیفہ آمر نے اس کی تمام املاک ضبط کرلیں، اس کی ان املاک میں کتابوں کی پانچ لاکھ جلدیں بھی تھیں، اور سب کی سب محل کے کتب خانے میں منتقل کر دی گئیں، وزیر ابراہیم علیہ الرحمہ نے بیس ہزار سے زیادہ جلدوں میں کتابیں چھوڑیں تھیں، اس کے محل میں متعدد نسخہ نویس تھے جو اس کے لیے لکھنے کا کام کیا کرتے تھے، اور اس کے عوض میں وہ ان کی کفالت کیا کرتا تھا، اس طرح اس کے پاس کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہو گیا تھا۔

اور جہاں تک اندلس کے مخصوص کتب خانوں کا سوال ہے، تو وہ بہت بڑی تعداد میں تھے۔ اور شاید اسلامی قلم رو کے کسی بھی حصے کے ذاتی کتب خانوں کو وہ شہرت نہیں حاصل ہوئی، جو اندلس کو حاصل ہوئی، جس کے باشندوں نے کتابوں کے کلیکشن اور ان کی جلد سازی وتزئین کاری میں بے دریغ خرچ کیا، اس اسلامی خطے کے کتب خانے بدرجۂ کمال ترقی یافتہ تھے، اور یہ اس تہذیب کی فطرت کا نتیجہ تھا جس کو اسلام نے وہاں وجود بخشا تھا۔

کتابوں کی فراہمی اور کتب خانوں کا قائم کرنا اہل اندلس کی عادت میں داخل ہو چکا تھا، اور

---

(۲) ابن ابی اصیبعہ ۱۶۳/۳ (۳) ایضاً: ۱۰۵/۲

علم ومعرفت کا ایک بڑا مظہر بن چکا تھا، اسی طرح دولت وثروت کا بھی ایک بڑا مظہر تھا، اہل اندلس کے ہاں کتابیں اور کتابوں کی فراہمی گھر کے اثاثے کی طرح ہوگئی تھی، جس کے دولت منداور جاہ پسند لوگ خواہش کیا کرتے تھے، کتابوں کے لیے ان کی حرص اہل علم ومعرفت کی حرص سے کسی طرح کم نہیں تھی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذاتی کتب خانے اندلس میں بڑے پیمانے پر پھل چکے تھے، حتی کہ قرطبہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں اندلس کے شہروں میں سب سے زیادہ کتابیں تھیں، اور وہاں کے لوگوں کو کتب خانوں کا بہت زیادہ اہتمام تھا، یہ بات مقرّی کی لکھی ہوئی ایک عبارت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ مقرّی نے قرطبہ کے ابن رشد اور اشبیلیہ کے ابن زہر کے ایک مباحثہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''ابن رشد نے قرطبہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ابن زہر سے کہا، کہ میں اور کچھ تو نہیں جانتا مگر یہ کہ جب اشبیلیہ کا کوئی عالم مرتا ہے اور اس کی کتابوں کو فروخت کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو اس کی کتابیں اس کے لیے قرطبہ لائی جاتی ہیں، پھر کہا کہ قرطبہ اللہ کی سرزمین میں کتابوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ زرخیز ہے''۔ (۱)

اندلس کے ذاتی کتب خانوں میں قاضی فطین بن سلیمان کا کتب خانہ تھا، یہ ابومطوف کے نام سے مشہور تھے، قرطبہ کے والی اور اندلس میں کتابوں کے بڑے شیدائیوں میں سے تھے، انھوں نے مختلف علوم میں اس قدر کتابیں جمع کر رکھی تھیں، کہ ان کے زمانے میں اندلس میں کسی اور نے نہیں کی تھیں، وہ جب کسی کے پاس کسی اچھی کتاب کے بارے میں سنتے تو اس سے اس کو خریدنے کی پیشکش کرتے، اور اس کی بہت زیادہ قیمت لگاتے، اگر ان کا اس پر بس چلتا تو خرید لیتے، ورنہ اس کو نقل کر کے واپس کر دیتے، ان کی کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ قرطبہ کے لوگ پورے ایک سال تک ان کی کتابوں کے فروخت کے لیے ان کی مسجد میں جمع ہوتے رہے، وہ کتابیں چالیس ہزار دینار کی قیمت تک پہنچ گئی تھیں''۔ (۲)

اسی طرح علامہ ابن حزم نے بھی ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا، مگر وہ آگ کی نذر ہو گیا تھا۔

ذاتی کتب خانوں کا قیام صرف مردوں ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس میں عورتوں نے بھی حصہ لیا تھا، خلافت اسلامیہ کے اس تابناک دور میں قرطبہ کے محلوں کی ایک مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک سوستر ایسی عورتیں تھیں، جو بہترین خط کوفی جانتی تھیں اور اسی خط میں قرآن کریم

(۱) نفح الطیب: ۱/۴۶۳ (۲) الصلۃ: ۱/۱۹۸-۲۹۹

لکھتی تھیں۔ (۱)

قرطبہ کے امیر احمد بن محمد بن قادم رحمہ اللہ متوفی ۴۰۰ھ = ۱۰۰۹ء کی لڑکی عائشہ کا - جو کہ قرآن کریم کی مشہور کتابت کرنے والیوں میں تھی - بہت بڑا ذاتی کتب خانہ تھا۔ (۲)

یہ اس وقت کی بات ہے جو یورپ کی لیڈیاں (عورتیں) جہالت کے نیچے دبی اور ظلم وستم کے شکنجوں میں کسی ہوئی تھیں۔

اندلس میں فراہمی کتب کی ایک اور قسم بھی معروف تھی، یہ وہ قسم تھی جو زینت وآرائش کے شوق اور کتابوں کی تجلید اور رنگ آمیزی کے اہتمام سے تعلق رکھتی تھی، چنانچہ اندلس کے ذاتی کتب خانوں کو اس طرح فروغ حاصل ہوا جس سے ان کے تقدم وپیش رفت اور اسلامی تہذیب کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔

اس تہذیبی ترقی کا یہ نتیجہ تھا کہ کتب خانے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے، اس کے شیدائیوں کی تعداد بہت تھی، اور تصانیف ومصنفین بہت تھے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایسے حکام تھے جنھوں نے علم کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب اسلامی کلچر اسپین کے لوگوں پر چھائی ہوئی تھی (یہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کی بات ہے) یہاں تک کہ بیشتر لوگوں کی زندگی تک اسلامی عادات اور عرب اسلامی ثقافت سرایت کر گئی تھی، ان لوگوں نے عربی زبان سیکھی، اس میں کتابیں لکھیں، عربی زبان سے متعلق ایسے کتب خانے قائم کیے، جس میں کافی دولت صرف ہوتی تھی، اور وہ علم ومعرفت کے حصول کے لیے مسلمانوں کی طرف ان کی توجہ کا نتیجہ تھا، اور یہ بات ایک اسپینی مصنف الفارو کے ان الفاظ سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ: ''عیسائی نوجوان جو اپنی غیر معمولی صلاحیت میں ممتاز ہیں، سوائے عربی کے کوئی اور علم اور ادب وزبان نہیں جانتے تھے، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ عربی کتابوں میں پورے شوق وشغف کے ساتھ مشغول رہتے تھے، اور ان کتابوں کے بڑے بڑے کتب خانے قائم کرتے تھے، جس میں بڑی بڑی دولت صرف ہوتی تھی، جب کہ مسیحی کتابوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کو ٹھکرا دیا کرتے تھے''۔ (۳)

---

(۱) الاسلام والحضارة العربية: ۲۵٦/۱ (۲) الصلة: ٦٥٤/۲

(۳) جرد نيبادم، جوستاف، حضارة الإسلام، تعريب: عبدالعزيز جاويد: ۸۱-۸۲

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

باسمہٖ اللہ

از اسٹیشن مرادآباد-محمد منظور نعمانی

۴/ذیقعدہ ۶۸، دوشنبہ

حضرت مخدومی محترمی! زید مجدکم

سلام مسنون۔ میں اس وقت دیوبند سے آرہا ہوں۔ دارالعلوم کو اس وقت ایک استاذ کی ضرورت ہے، مولانا حفظ الرحمٰن نے اور اس نیازمند نے پھر یہ چاہا ہے کہ جناب دارالعلوم میں تشریف لے آئیں، اگرچہ پہلے تجربہ کے بعد یہ جرأت شاید کرنی نہ چاہئے تھی، لیکن پھر یہ جرأت کی گئی ہے، چار حضرات کے نام ہم دونوں نے تجویز میں لکھ دیے ہیں کہ بالترتیب ان حضرات میں سے کسی ایک کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور پہلے نمبر پر اسم گرامی جناب ہی کا لکھ دیا ہے۔ اس عریضہ کے ذریعہ بس یہ گزارش کرنی ہے کہ بہت کچھ سوچنے سمجھنے اور ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میری رائے یہی ہے کہ جناب خود بھی اپنے لیے یہی طے فرمالیں اور مفتاح العلوم کے حضرات بھی یہی طے فرمادیں، ہندوستان کے مستقبل کا مسئلہ کچھ ایسا ہے کہ بڑے بڑے جو دو چار مدرسے ہیں صرف انھی سے اب قائم رہنے اور کچھ کرنے کی توقع ہے، اس لیے ان کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی اب کوشش کرنی چاہئے۔

دارالعلوم میں یہ جگہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے تشریف لے جانے سے پیدا ہوئی ہے، جہاں تک میرا اندازہ ہے اسباق میں ایک آدھ حدیث کا رہے گا، غالباً دو دورۂ تفسیر کے، ایک آدھ شاید ادب کا بھی یعنی حماسہ وسبعہ معلقہ۔

درجہ علیا کا گریڈ سوا سو سے شروع ہوکر دوسو پچاس تک پہنچتا ہے۔ آج کل ۲۵ فیصد الاؤنس گرانی ملتا ہے، اگر جناب تشریف لانے پر آمادہ ہوں گے تو یہ بھی غالباً ہو سکے گا کہ شروع ہی میں چند گریڈ بڑھا دیے جائیں، جس کے بعد مجموعی یافت قریب پونے دوسو ماہوار ہو جائے گی۔

خیر یہ تو ثانوی مسئلہ ہے، اصل تو یہ ہے کہ جناب دار العلوم میں آجانے کا فیصلہ فرمالیں۔

میں اس وقت سنبھل جارہا ہوں، کل وہاں سے لکھنؤ کو روانہ ہوں گا اور صرف دو دن وہاں ٹھہر کر حجاز کے ارادہ سے انشاء اللہ بمبئی روانہ ہو جاؤں گا، اگر پروگرام یہ نہ ہوتا تو بجائے اس خط کے اس معاملہ پر زبانی گفتگو کے لیے میں خود مئو حاضر ہوتا۔ میرے خیال سے جناب کے تشریف لانے سے مفتاح العلوم کے کام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا، حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب و مولانا محمد ایوب صاحب وہاں کے کام کے لیے کافی ہیں۔ ان ہر دو بزرگوں سے بھی میری گزارش ہے کہ مقامی جزئی مصالح سے نظر بلند فرما کر اس مسئلہ پر غور فرمائیں۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان حضرات کو الگ عریضہ اس وقت نہیں لکھ سکا رہا ہوں گویا یہی عریضہ ان حضرات کے نام بھی ہے۔

....

ہے تو اصول کے خلاف اور بے تمیزی بھی، چونکہ اس وقت الگ الگ خطوط لکھنا بس میں نہیں اس لیے یہ زحمت دیتا ہوں کہ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب، مولانا محمد ایوب صاحب، مولانا محمد احمد صاحب، مولانا عبد الجبار صاحب، مولانا منیر الدین صاحب کی خدمت میں بعد سلام مسنون میری یہ درخواست بھی پہنچا دیں کہ جو کوتاہی اور تکلیف دہی میری طرف سے ہوئی ہو اللہ کے لیے اس کو معاف فرمادیں۔

خصوصاً مولانا منیر الدین صاحب کے متعلق یاد ہے کہ مئو کی آخری حاضری کے موقع پر میری طرف سے ان کے ساتھ ایک زیادتی ہوئی جس میں میں ناحق پر تھا۔ اگر وہ اپنے کرم سے اُس کو معاف فرمادیں تو میں بہت ممنون ہوں گا اور ان کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ چونکہ بہت زیادہ تعلق جناب سے رہا ہے، اس لیے معلوم نہیں کتنی کوتاہیاں ہوئی ہوں گی، اس لیے حضرت سے بھی خصوصیت سے یہی درخواست ہے کہ اللہ کے لیے معاف فرمادیں، والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

حضرت محترمی و معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

گرامی نامہ موصول ہو گیا تھا، جو کاتب مجاہد صاحب اعیان الحجاج لکھ رہے ہیں، معلوم ہوا تھا کہ وہ کہیں باہر چلے گئے تھے، پھر واپس آنے کے بعد انھوں نے اس کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔

پہلے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ الفرقان کا زیادہ سے زیادہ حصہ وہی لکھیں، اس دفعہ اس لیے ان سے نہیں لکھایا گیا کہ کتاب کی تیاری میں دیر نہ ہو، میں نے شاید عرض بھی کیا تھا کہ کتابت کا مسئلہ بالکل بے قابو ہے، میں برابر کہہ رہا ہوں اور کہتا رہوں گا کہ کتاب شعبان میں تیار ہو جانی چاہئے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ مسئلہ کاتب سے اٹکا ہوا ہے، میں نے مجبوراً اپنی دو کتابیں اس وقت دوم سوم درجہ کے ایک کاتب کو دے رکھی ہیں، جو میرے ذوق اور مسلک کے خلاف ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

مولانا ابوالوفا افغانی کی تحریر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی، صاحب فن اگر داد دے تو جی خوش ہونا قدرتی بات ہے۔

میری طبیعت ابھی تک کمزور چلی جا رہی ہے، تاہم کل ایک سفر شروع کرنے والا ہوں، واپسی انشاء اللہ ایک ہفتے میں ہو جائے گی اور خدا نے چاہا تو رجب کے دوسرے ہفتے میں جب لکھنؤ تشریف آوری ہوگی تو میں یہیں ہونگا۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

اضافہ از عتیق:- سات پروف تو جا چکے ہیں، آٹھویں کاپی کاتب صاحب نے کل دینے کا وعدہ کیا ہے۔

....

باسمہ سبحانہ وتعالی

لکھنؤ ۲ رجنوری ۶۱

مخدومی محترمی! دامت فیوضکم

میں ایک ضرورت سے علی گڈھ گیا ہوا تھا، آج ہی صبح واپسی ہوئی، گرامی نامہ کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔

بیشک موسم تو سردی کا ہے کہ سردی کی وہ خاص لہر تو الحمدللہ ختم ہوچکی ہے، صرف موسمی سردی ہے جو زیادہ سخت نہیں ہے، میں خود اس حال میں ہوں کہ سردی بالکل برداشت نہیں کرسکتا، لیکن میری گزارش ہے کہ یہ سردی سفر سے مانع تو نہ ہونی چاہئے، احتیاط پوری انشاءاللہ کی جائے گی۔ مئو سے یہاں تک کا سفر مناسب خیال فرمائیں تو دن میں فرمالیں، یہاں سہارنپور کے لیے ضروری انتظام انشاءاللہ ایسا کرلیا جائے گا کہ سردی کوئی ضرر نہ پہنچا سکے۔

جب تک گاڑی چل سکے سال میں ایک سفر تو کم از کم ہو ہی جانا چاہئے۔ اس اصرار میں اصل کام کے علاوہ ظاہر ہے کہ میری خود غرضی کو بھی دخل ہے۔ ایسے اطمینان کی معیت واستفادہ کا موقع کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

....

انوارالباری کے مقدمہ پر بس کہیں کہیں سے نظر پڑی ہے، مجھے تو وہ پسند نہیں آئی، خاص کر اس کا یہ پہلو افسوس ناک ہے کہ اس سے منکرین حدیث کافی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

ایضاح البخاری کا صرف پہلا حصہ دیکھا تھا اور اس حیثیت سے میں نے اس کو پسند کیا تھا کہ بالکل نوآموز نوجوان نے اس کو مرتب کیا ہے، میں نے ان کو ہمت افزائی کی خاطر بھی لکھا تھا اور کچھ مشورے بھی دیے تھے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

بھائی مولوی رشید احمد صاحب اور مولانا عبدالجبار صاحب سلام مسنون قبول فرمائیں۔

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۱۶/رجب ۸۱

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

خدا کرے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہو۔ نیاز حاصل ہوئے قریب قریب ایک سال ہوچکا ہے، شاید عرصہ کے بعد ایسا اتفاق ہوا ہے۔

مجلس شوریٰ کا دعوت نامہ موصول ہو چکا ہوگا، گذشتہ مجلس شوریٰ نے جو کام جائزہ کمیٹی کے سپرد کیا تھا (جس میں اس عاجز کو بھی رکھا گیا تھا) اس کو درمیان سال میں دو تین دفعہ وقت دیا جا چکا ہے، پھر بھی باقی ہے اور طے یہ ہوا تھا کہ شعبان کی مجلس شوریٰ کے موقع پر ہم لوگ ۳-۴ دن پہلے آ کر اس کو مکمل کرلیں گے، لیکن میں نے لکھ دیا تھا کہ میں آخر رجب تک نہ آسکوں گا، اب مجلس کی تاریخ ۸-۹ جنوری مقرر ہو چکی ہے۔ اب تک میرا پروگرام ۲۹ر تک ترمذی ختم کرانے کا تھا اور یہ بھی سخت محنت اور انتہائی تیز رفتاری سے ممکن تھا۔ آج میں نے مہتمم صاحب کو لکھا ہے کہ میں اب یہ کوشش کروں گا کہ کسی طرح ۲۷ تک ختم کرا کے ۲۸ یا ۲۹ تک پہنچ سکوں، اس سے پہلے میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

۲۷ کو جمعہ ہوگا اور ۲۸ کو شنبہ، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ جمعرات یا جمعہ کو جناب یہاں لکھنؤ تشریف لے آئیں، اگر میں جمعہ کو ختم کرا سکا تو جمعہ ہی کو حسب معمول دہرہ سے ورنہ شنبہ کو دہرہ ہی سے انشاء اللہ روانہ ہو سکیں گے۔ خیال ہے کہ اگر جمعہ کو روانگی ہوئی تو شنبہ کو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے دسترخوان پر کھانا کھا کے بعد ظہر دیوبند چلے چلیں گے ورنہ سیدھے دیوبند، والسلام طالب دعا۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۵ر دسمبر ۶۱

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۲۹ر دسمبر ۶۱

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

آج تیسرا دن ہے میں نے عریضہ ارسال خدمت کیا تھا، اس میں جمعہ کی روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ بعد میں غور کرنے سے رائے یہ قائم ہوئی کہ اس جائزہ والے کام کی تشکیل کے لیے مجھے حتی الوسع جمعہ تک پہنچ ہی جانا چاہئے، اس لیے اب میں نے طے کیا ہے کہ ترمذی شریف جمعرات ہی کو ختم کرانے کی کوشش کروں گا اور جمعرات ہی کی شام کو دہرہ سے انشاء اللہ روانہ ہو کر صبح سہارن پور اور شام

تک انشاء اللہ دیو بند پہنچ جاؤں گا، اب میری گزارش ہے کہ جناب والا جمعرات کی صبح تک تشریف لے آویں، دن میں آرام فرمالیں اور پھر شام کو دہرہ سے تشریف لے چلیں۔ جناب کا بھی پہلے تشریف لے چلنا انشاء اللہ اس جائزہ والے کام میں بھی بہت مفید ہوگا۔

میں جمعہ کی صبح کو منتظر رہوں گا۔

دعا کا محتاج وطالب محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

فیض آباد اور لکھنؤ کے درمیان ۔ ۴؍ اکتوبر چہار شنبہ ۷؍ بجے صبح

حضرت معظمی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

آج سے ۵ دن پہلے ۳۰؍ ستمبر کو لکھنؤ سے ٹاٹا نگر جاتے ہوئے میں نے ایک عریضہ راستہ ہی سے لکھا تھا، اس میں عرض کیا تھا کہ اگر موقع نکل سکا تو انشاء اللہ واپسی میں حاضر خدمت ہو کر لکھنؤ جاؤں گا۔ غالبًا یہ عریضہ پرسوں دوشنبہ کو موصول ہوا ہوگا۔

وقت کی تنگی کے باوجود میں اس حساب سے پروگرام بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ٹائم ٹیبل کی روشنی میں میں نے پروگرام بنایا تھا، میں ٹاٹا نگر قریباً صرف ۲۴-۲۵ گھنٹے رہ کر دوشنبہ کو وہاں سے آسنسول روانہ ہو جاؤں اور پنجاب میل پکڑ کے سہ شنبہ کی صبح ۹ بجے بنارس پہنچ کر دوپہر کو مئو پہنچ جاؤں۔ چنانچہ اجتماع کے ذمہ دار دوستوں سے پہنچتے ہی میں نے کہہ دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس میں ترمیم نہیں ہوگی۔ بیچاروں کو مجبور ہو جانا پڑا، اور میں اس حساب سے ٹاٹا سے آسنسول کے لیے پرسوں دوشنبہ کو دوپہر کا کھانا کھا کے روانہ ہوگیا، آسنسول پہنچ کر معلوم ہوا کہ پنجاب میل جس راستہ سے آسنسول سے پٹنہ کی طرف جاتا ہے اس پر کوئی حادثہ ہوگیا ہے، اس لیے پنجاب میل بردوان سے ہی کسی دوسرے راستہ پٹنہ کی طرف چلا گیا وہ آج یہاں نہیں آئے گا۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد کالکا میل آتا ہے جو گیا کے

راستہ پنجاب میل سے بھی پہلے مغل سرائے آجاتا ہے، میں اس پر سوار ہوگیا تاکہ مغل سرائے میں پنجاب میل پکڑ کے اپنے پروگرام کے مطابق بنارس پہنچ جاؤں، رات کو اطمینان سے سویا۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ کالکا میل والے راستہ میں بھی کہیں لائن پر پہاڑ گر گیا ہے اور یہ بہت چکر کے کسی راستہ سے چل رہا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ کالکا میل جس کو کل صبح سات بجے مغل سرائے پہنچنا تھا وہ ۱۴ گھنٹے لیٹ گذشتہ رات دس بجے کے قریب مغل سرائے پہنچا۔ سارا نظام درہم برہم ہوگیا، طبیعت بھی نہایت پریشان ہوئی، دہرہ ایکسپریس جس کو کل دن میں دس بجے مغل سرائے آنا تھا وہ رات ایک بجے آیا اور میں اس سے اس وقت لکھنؤ جارہا ہوں، ریل میں بیٹھے بیٹھے ۴۰ گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں اور کل پورا دن کسی ایسے علاقہ میں ٹرین چل رہی تھی کہ چائے بھی نہیں مل سکی۔ امید کہ معذور تصور فرمایا جائے گا، والسلام۔

نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ-۳/۱/۶۲

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔ کل کا مرسلہ عریضہ موصول ہو چکا ہوگا۔ اس میں یہ عرض کرنے سے غالباً رہ گیا کہ اب میں نے جمعہ کی شام ہی کو روانگی طے کی ہے۔

اگر ہمت اجازت دے تو میری گزارش تشریف لے چلنے ہی کی ہے، لیکن میں اصرار کر کے تکلیف دینے کے لیے خود بھی تیار نہیں ہوں۔

اگر میری گزارش کے بعد بھی طبیعت آمادہ نہ ہو تو پھر جو مناسب ہو وہ فیصلہ فرمائیں، ہاں اگر سفر ہوا تو انشاءاللہ سردی کی وجہ سے زحمت نہ ہوگی، والسلام۔

طالب دعا

نعمانی غفرلہ

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

خالہ محترمہ

گزشتہ چند مہینے ہمارے لیے بڑے صبر آزما رہے ہیں، جن کے اندر متعدد مخلصوں اور بہت قریب کے رشتہ داروں کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا ہے۔ ان میں پہلا حادثہ ہماری ایک خالہ کا ہے، جن کا نام ''رضیہ'' تھا، اور وہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری صاحبزادی تھیں، سرپرست ''المآثر'' حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتہم سے عمر میں بڑی تھیں، عمر ۹۰ برس کے قریب رہی ہوگی، طویل علالت کے بعد ۱۵/شعبان ۱۴۳۵ھ=۱۴/جون ۲۰۱۴ء بروز سنیچر شب کے آخری پہر اس دنیا سے رحلت فرما گئیں، اسی دن ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ اور تدفین ہوئی۔ دیندار، عبادت گزار اور پابند صوم وصلاۃ تھیں، چونکہ ان کی نشو ونما اور تربیت دیندارانہ ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے دین داری اور پرہیزگاری کا رنگ ہونا فطری بات تھی۔ عرصہ سے صاحبۂ فراش تھیں، اسی دوران دو سال قبل ان کے بڑے لڑکے کچھ دنوں کی علالت کے بعد وفات پا گئے تھے، پیرانہ سالی میں پہنچنے والا یہ صدمہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا، اور اس نے ان کے اوپر بہت زیادہ اثر ڈالا تھا، تا آنکہ ان کے لیے بھی پیام اجل آ پہنچا، اور دنیا کے مصائب وآلام سے نجات پا کر قبر کی آغوش میں چلی گئیں، اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، اور ان کی قبر پر رحمت ورضوان کی بارش برسائے، آمین۔

....

ایک پھوپھی زاد بہن

مذکورہ حادثے کو ایک عشرہ بھی نہیں گزرا تھا، کہ ایک دوسرے سنگین حادثے سے دوچار ہونا پڑا، ۲۴/شعبان ۳۵ھ=۲۳/جون ۱۴ء بروز دوشنبہ راقم کی ایک پھوپھی زاد بہن چندروزہ علالت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ مرحومہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑی تھیں، لیکن ہم دونوں میں بچپن سے بڑی مؤانست تھی، اس لیے ان کا سانحۂ ارتحال بڑا ہی جانکاہ حادثہ تھا، بہت ہی نیک اور پابند صوم وصلاۃ تھیں، احکام شریعت کا بھی ان کو بڑا لحاظ رہا کرتا تھا، ان کی اولاد میں کئی ایک بچے اور بچیاں ہیں، خداوند کریم مرحومہ کی بال بال مغفرت اور ان کی اولاد کی نگہبانی اور حفاظت فرمائے، آمین۔

قاری محمد قاسم بھوپالی مدراسی

۱۷/ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ=۱۳/ستمبر ۲۰۱۴ء کو ڈاکٹر سرفراز صاحب الہ آبادی نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ شب کے تقریباً ایک بجے قاری محمد قاسم انصاری کی حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ناگہانی وفات ہوگئی، اس وقت قاری صاحب بھوپال میں تھے اور کسی تقریری پروگرام میں شریک تھے، یہ خبر ایسی غیر متوقع تھی کہ سن کر اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

قاری صاحب ایک شریف النفس، سادہ طبیعت، اور خلیق ومتواضع انسان تھے، شخصیت میں متانت وسنجیدگی اور وقار تھا، اصلاً بھوپال کے تھے، لیکن عرصۂ دراز سے مدراس میں مقیم تھے، وہاں ان کا برسہا برس سے درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا، جو کافی مقبول تھا، وہ ایک بہت اچھے واعظ اور مقرر بھی تھے، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور ندوے کی مجلس انتظامی کے رکن رکین بھی تھے۔

قاری صاحب، حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی وتحقیقی خدمات سے بہت متاثر تھے، ادارہ ''المآثر'' پر نظر عنایت رکھتے تھے۔ پرسش احوال کے لیے کبھی کبھی خود ہی فون بھی کرلیا کرتے تھے۔

الغرض بڑی خوبیوں اور اوصاف حمیدہ کے حامل تھے، ایسے مہربانوں کی جدائی کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے، اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، اوران کی دینی خدمات کو قبول فرما کر بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

پروفیسر عبدالحی فاروقی

۷/ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ مطابق ۳/ستمبر ۲۰۱۴ء کو یہ افسوسناک خبر ملی کہ ۲/ستمبر کی شب میں جامعہ ہمدرد کے شعبۂ دراسات اسلامی (اسلامک اسٹڈیز) کے سابق صدر پروفیسر عبدالحی فاروقی کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں ان کے جسد خاکی کو دیوبند لے جایا گیا، وہاں ان کی نماز جنازہ ہوئی اور مزار قاسمی میں تدفین ہوئی۔

پروفیسر عبدالحی فاروقی، امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے پوتے، اور حضرت مولانا عبدالمؤمن لکھنویؒ کے لخت جگر تھے۔ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے، مذہبی اور دینی ماحول میں تعلیم وتربیت ہوئی، تعلیم دینی کے علاوہ عصری بھی حاصل کی، انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات اور عربی زبان وادب سے ایم۔اے۔کیا، ان کی استعداد وصلاحیت تھی کہ حکیم عبدالحمید مرحوم کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی اور وہ ان کو جامعہ ہمدرد لائے اور علم طب کی شہرۂ آفاق کتاب القانون فی الطب کا انگریزی ترجمہ ان کے سپرد کیا، بعد میں وہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ مقرر ہوئے، اور ایک مدت تک اس شعبے کی سربراہی کے بعد ۲۰۰۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

انھوں نے اپنے جدامجد کی ایک مبسوط سوانح عمری بھی تصنیف کی ہے، جو''امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب لکھنویؒ حیات وخدمات'' کے نام سے ۷۷۲صفحات میں شائع ہوچکی ہے، جس میں امام اہل سنت کے علمی ودینی کارناموں کا تفصیل سے تعارف پیش کیا گیا ہے، اور ہمارے علم کے مطابق اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، خداوند قدوس سے دعا ہے کہ ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

....

والد ماجد ڈاکٹر سرفراز احمد الہ آبادی

۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۹؍ستمبر ۲۰۱۴ء دوشنبہ کی شب میں ہمارے مخلص وکرم فرما ڈاکٹر سرفراز احمد صاحب کے والد ماجد جناب قمرالدین صاحب الہ آبادی مختصر سی علالت کے بعد سفر آخرت اختیار کرگئے، مرحوم کی عمر پچاسی برس رہی ہوگی، راقم کی ان سے ایک ہی دفعہ ملاقات ہوئی ہے، بہت شفقت ومحبت اور اخلاق کریمانہ سے پیش آئے، طبیعت میں سنجیدگی، متانت اور وضع داری تھی، ادارہ ''المآثر'' سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے، آمین یارب العالمین۔